UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222093
UNIVERSAL
LIBRARY

۷۸۶

ماہ و پروین

مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

مصنفہ

میر ولی اللہ صاحب بی-اے-ایل ایل بی میونسپل کمشنر
ایبٹ آباد

حسب اجازت مصنف
نیرنگ خیال پبلشنگ کمپنی لاہور نے شائع کیا

قیمت بارہ آنے (۱۲) علاوہ محصول ڈاک

پتہ (مینیجر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور)

(ب)

CHECKED 19..
۱۹۱۵۷۳
Checked 1969.
Checked 1975

فہرست مضامین

(۱) دال کی فریاد

(۲) کتابوں کی چوری

(۳) ذوالسیٹین

(۴) آرڈر

(۵) عید مبارک

(۶) گرما و سرما

(۷) یا ایہا المنافقون

(۸) مولوی صاحب کا گھوڑا

دیباچہ

ماہ و پروین پر دیباچہ لکھنا اس لئے ضروری ہے کہ ماہرین فن ان مضامین کی اہمیت سے واقف ہو جائیں۔ ماہ و پروین مجموعہ ہے چند مضامین کا جو مزاحیہ رنگ میں لکھے گئے ہیں اور ملک میں بے حد پسند کئے گئے ہیں۔

نیرنگ خیال کے اجراء سے ہندوستان کی ادبی فضا میں جو حیاتِ نو پیدا ہوئی ہے اس کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔ اس حیاتِ تازہ میں مزاحیہ نگار بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ نیرنگ خیال نے سب سے اول چچا چھکن۔ سودیشی ریل۔ مرزا ہندو بیگی۔ چارپائی۔ شریر بیوی۔ چٹھی رساں اور بائیسکل جیسی طرز کے درجنوں عنوانات پر ایسے مضامین شائع کئے جنھیں طرح نو کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملک میں اس جدت کی ایسی قدر ہوئی کہ چند ہی سالوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ۔ رشید احمد صدیقی۔ پطرس۔ سید امتیاز علی تاج۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ ایم۔ ایم اسلم۔ حضرت شوکت تھانوی ملا رموزی۔ ناکارہ حیدرآبادی کے نام سے لوگ آشنا ہو گئے اور اُن کی تصنیفات کی مانگ پیدا ہو گئی۔

میں ماہ و پروین کے دیباچہ میں ہندوستان کے مشہور مزاحیہ نویسوں پر نہ تو تنقید کرنا چاہتا ہوں نہ اُن کا فرق واضح کروں گا کیونکہ یہ کام تفصیل چاہتا ہے اور یہاں صرف چند صفحے اس کے لئے مخصوص ہیں۔ لہٰذا میں اختصار کے ساتھ بعض اصولی باتیں عرض کروں گا اور اصل بحث کو دوسرے موقعہ کے لئے اٹھا رکھوں گا۔

موجودہ مزاحیہ نویسوں میں بیشتر اہلِ قلم آپ کو ہنسانے کے لئے قسم قسم کے سوانگ بھرتے ہیں۔ کوئی اپنی بیوی بچوں کو رسوا کرتا ہے کوئی کسی دوست یا عزیز کو نشانہ بناتا ہے۔ کوئی خود مار کھاتا ہے۔ کوئی کیچڑ میں لتھڑا پڑا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ اس کے پھسلنے پر ہنسیں۔ بالکل اسی طرح سے جب بھانڈ نقلیں کرتے ہیں تو ایک مار کھائے جاتا ہے اور لوگ بے اختیار ہنسے جاتے ہیں جو مار کھاتا ہے وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ یہ اس کا کمال ہے کہ وہ دوسروں کو ہنسا رہا ہے۔ بعض مزاحیہ نویس جو خود ہنسی کا مرکز بننا نہیں چاہتے وہ کسی دوسرے کی پگڑی اچھال کر آپ کو ہنسانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اپنی تحریروں میں مذاق کا رنگ پیدا کرنے کے لئے انھیں دوسروں کی رسوائی اور بے عزتی سے بھی گریز نہیں۔ ہمارے مزاحیہ نویسوں کی تیسری قسم ان سب سے بدتر ہے وہ دوسروں کو ہنسانے کی جگہ خود ہنستے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی ہنسی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے بھی ہنسیں۔ الغرض ہمارے مزاحیہ نویس ابھی تک صحیح ظرافت اپنی تحریروں میں پیدا نہیں کر سکے۔

مزاحیہ مضامین کی بنیاد تین باتوں پر ہوتی ہیں۔ ایک کی بنیاد زبان کی خوبیوں پر موقوف ہے۔ یہ زیادہ تر مرزا فرحت اللہ بیگ میں پائی جاتی ہے دوسرے واقعات کا تسلسل اس طرح سے قائم کرنا جس سے پڑھنے والا متاثر ہو کر بے اختیار ہنستا چلا جائے یہ چیز پطرس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تیسری چیز نویسندہ کا تبحر علم ہے۔ جو علوم و فنون کے بحر پایاں میں مضمون کو کھینچ کر لے جاتا اور ایسے ایسے نکتے پیدا کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان سے متاثر ہو کر کبھی زیر لب مسکراتا ہے اور کبھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ تیسری نوع میں مرزا دلی اللہ بہت نمایاں ہیں۔ سید رشید احمد صدیقی اور بسوق مرحوم بھی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو کے باقی مزاحیہ نویس بھی اپنی اپنی جگہ تخصیص رکھتے ہیں اور اچھا کام کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو مزاحیہ نویسی اس وقت ادب العالیہ کا طرۂ امتیاز بنی ہوئی ہے لیکن میرے خیال میں ابھی وہ عالمِ طفولیت سے آگے نہیں بڑھی اور ابھی اس کے شباب کا زمانہ بہت دور ہے

ہوسکتا ہے کہ آئندہ دور کے مزاحیہ نویس اس میں حقیقی مزاح کی کیفیت پیدا کر کے اسے جاندار بنا سکیں۔

ماہ و پروین میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل بی میونسپل کمشنر ایبٹ آباد کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ میر ولی اللہ ملک کے اُن چند مشہور انشاپردازوں میں سے ہیں جنھیں قدرت سے ذوقِ سلیم اور علم وافر عطا ہوا ہے آپ کو شعر و سخن سے وابستگی ہے۔ عربی اور فارسی کے آپ عالم متبحر ہیں انگریزی اور اردو میں سُلجھا ہوا مذاق پایا ہے ان تمام خصوصیات کے ساتھ جب آپ نے مزاح نویسی پر قلم اٹھایا اس میں حقیقت کی ایک خاص جھلک نمایاں ہونے لگی۔ آپ کی تحریروں میں سنجیدگی کے ساتھ ظرافت کی چاشنی پائی جاتی ہے جس کے مطالعہ کے بعد طبیعت میں کسی قسم کا ناگوار احساس پیدا نہیں ہوتا۔ قہقہہ ہنسی اور مسکراہٹ تینوں کیفیتیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہیں مگر لغزشوں سے پاک۔

کہتے ہیں کہ سنجیدہ ظرافت لکھنا سب سے مشکل ہے اگر یہ مقولہ صحیح ہے تو میر ولی اللہ صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے علم کے دریا بہاتے ہوئے سنجیدہ ظرافت کی نادر مثالیں پیش کی ہیں۔ سب سے کامیاب ظرافت وہ ہے جس سے اصلاح اخلاق مقصود ہو اور وہ اس طرح ہے کہ جس پر ہنسا جائے وہ خود اپنی کمزوری پر ہنسے۔ یہاں تک کہ اپنی کمزوری کو ترک کر دے۔

مشہور فاضل شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد نے خوش طبعی پر جو کچھ لکھا ہے وہ میں یہاں نقل کرتا ہوں اور اس پر کسی قسم کی رائے زنی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہمارے مزاحیہ نویس اگر اس آئینہ میں اپنا منہ دیکھیں گے تو کسی نہ کسی کونہ میں انھیں اپنا چہرہ ضرور نظر آئیگا

یوسف حسن

مولانا محمد حسین آزاد کی رائے ہے۔

خوش طبعی کی تعریف میں یہہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے البتہ یہہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایہ اور استعارہ سے بیان کروں اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں جو کہ نسب نامہ مندرجہ ذیل میں درج ہیں یہ واضح ہو کہ صحیح۔ خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حُسن ادب ایک نہایت معقول شخص تھا اس کا بیٹا حُسن بیان ہوا۔ اُس نے ایک اپنے برابر کے خاندان میں شادی کی۔ اُس کی دُلہن کا نام خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی چنانچہ اُن کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا لب لباب تھا اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی القضات یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھلاتے لیکن چونکہ ماں کے دُودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے اس لئے کسی حالت میں ہو اہل محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا۔

اسی کے ہمسایہ میں ایک مکر باز جعل ساز بھی رہتا تھا کہ اس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم مقام سمجھتے تھے پس اس خیال سے کہ نیک مرد ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آجائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے والے اگر کبھی کسی ایسے شخص سے ملیں تو اس اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا صحیح قبیلے سے جا ملتا ہے یا نہیں اور حقیقت میں وہ حُسن ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور سے اگر یہ نہ ہو تو وہی جعلساز بہروپیہ سمجھیں تو ایک پہچان اس کی یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی محفل میں بیٹھا ہوتا ہے تو اسی کے

قہقہے کان میں آتے ہیں اور گرد اس کے متین اور معقول لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور جب ظرافت اصلی محفل آرا ہوتی ہے تو آپ کمال سنجیدگی سے بیٹھی ہوتی ہے گرد اس کے سب ہنستے ہیں۔

بلکہ اتنی بات اور بھی کہتا ہوں کہ اگر اس کے خاندان میں خوش طبعی یا خندہ جبینی یا خوش بیانی کسی کی بُو نہ آئے تو اسے بھی وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھنا چاہیئے۔ جس بہروپیہ بھانڈ کا میں نے ذکر کیا وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد سے ہے اور جھوٹ در حقیقت زٹل کا باپ تھا۔ زٹل سے ایک بیٹا پیدا ہوا اس کا نام سڑی مستان تھا۔ اسی طرح حماقت ایک پھوڑ عورت تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی جسے مسخرن دوانی کہتے تھے۔ اس سے سڑی مستان نے شادی کی۔ ان دونوں سے عجب طرفہ معجون بچہ پیدا ہوا۔ جسے تم بہروپیہ بھانڈ سمجھتے ہو بعض اشخاص کو بعض اوقات اس کے کلام میں بھی خوش طبعی یا خوش بیانی کی بُو آتی ہے مگر وہ حقیقت ظرافت بد اصل ہے اب میں ان دونوں کا نسب نامہ لکھتا ہوں

جھوٹ	سچ
زٹل	حُسنِ ادب
سڑی مستان۔ مسخرن دوانی	حسنِ بیان
ظرافت بد اصل یا نقلی	خوش طبع خاوند۔ خندہ جبینی بی بی
یعنی بہروپیہ بھانڈ	ظرافت اصلی یا خوش طبعی

میں اس استعارہ کو زیادہ تفصیل دیتا اور ظرافت بد اصل یعنی بہروپیے بھانڈ کی اولاد جو ریگ بیاباں سے بھی زیادہ ہے سب کا حال نام بنام بیان کرتا خصوصاً اُن لڑکے لڑکیوں کا کچھ حال لکھتا جن سے ملک وجود میں اس نے اپنی ناپاک نسل پھیلائی ہے مگر اس سے جا بجا حسد کی آگ اٹھتی اس لئے جی نہیں چاہتا پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ظرافت اصلی اور ظرافت نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدمی اور بندر میں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغابازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے اس قسم کے کام کر کے نہایت خوش ہوتا ہے بلکہ دونوں باتیں اسے یکساں ہیں خواہ رسوا کر دے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت و احترام بنا دے۔ ابھی چٹکیوں میں اُڑا دے۔ کسی کی نافہمی و بدعقلی دکھا دے۔ کسی کی دانش و دانائی سُنا دے ابھی دولت و نعمت کی مسند پر بٹھا دے۔ ابھی کنگال فقیر بنا دے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ تیسرے ایسا کم بخت ہے کہ جو ہاتھ اسے رزق دیتا ہے اسی کو کاٹ کھاتا ہے اور دوست دشمن دونوں کی برابر خاک اڑاتا ہے سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے اس لئے خوش طبعی کئے جاتا ہے جیسی ہو سکے اور جہاں ہو سکے۔ نہ یہ کہ جیسی ہونی چاہیئے۔ چوتھے چونکہ عقل سے بالکل محروم ہے اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا پانچویں چونکہ ہنسی چُہل کے سوا اور کسی قابل نہیں اور ہر شخص پر فوقیت کی ہوس رکھتا ہے اس لئے اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے یعنی کسی صاحب معاملہ یا کسی صاحب تصنیف کی ذات سے منسوب ہوتا ہے نہ کہ فقط اس کی بُرائی یا اس کی تصنیف سے۔

محمد حسین آزاد

میر ولی اللہ

دال کی فریاد

ایک درسی نظم کی شرح

اور

ایک عظیم الشان علمی انکشاف

مثنوی مولانا روم کا ایک نادر الوجود نسخہ

حضرت مولٰنا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سابق مدرس فارسی گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ دفتر اشاعت دی اورنیٹل پبلشنگ کمپنی ۲۳۸ اورنیٹل ہوس میرٹھ مطبوعہ زبان پریس دہلی زمانۂ حال کے مشہور شعراء میں سے ہیں (یا مشہور شعراء میں سے تھے۔ واللہ اعلم تحقیقت الحال دشرحِ فریاد الدال) لیکن "شاعرانِ حال" کی طرح مولانا مشار الیہ نئے نئے مضمون لانے سے قاصر نہ تھے۔ اور نیا تخلص ڈھونڈنے کی انہیں ضرورت ہی نہ تھی۔ کیونکہ وہ اکثر بے تخلص لکھا کرتے تھے۔ تازہ مضامین کی تلاش میں انھیں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ انھوں نے پرانی شاعری کی لائن کو یک قلم چھوڑ دیا اور اپنے سمندِ سخن کی جولانی کے لئے ایک نیا میدان

ڈھونڈھ لیا۔ پرانے شاعر بیچارے شمع و پروانہ۔ گل و بلبل۔ بہار و خزاں اور یاس و امید کے مکالمے لکھا کرتے تھے۔ مولانا نے دال چپاتی۔ پودے اور گھاس۔ جگنو اور بچّے اور مور اور کلنگ کے مکالمے لکھنے شروع کر دئے۔ یہ نئی سرزمین میدانِ سخن کی یکہ تازیوں سے اب تک چونکہ محفوظ رہی تھی۔ اس لئے آنجناب کو اس کی لانہایت وسعتوں میں اپنے پلنگ بیشہ اندیشہ کے لئے صید معنی کے اتنے بے تعداد امکانات نظر آئے جتنے یورپ والوں کو امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی نظر نہ آ سکے تھے۔ پھر کیا تھا پن چکّی پر۔ اسلم کی بلّی پر۔ گھوڑے اور کتّے پر۔ ریل گاڑی پر۔ گائے پر، اونٹ پر، فادر ولیم پر۔ چھوٹی چیونٹی پر، ارل آف میو پر، ملکہ وکٹوریہ پر، کوئے پر، مور پر حتیٰ کہ کوہ ہمالیہ پر نظمیں لکھی گئیں۔ اور خوب لکھی گئیں۔ پرانے شاعروں کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی بلند پروازیوں سے متاعِ سخن کو فرشِ زمین سے اٹھا کر عرشِ بریں تک پہنچا دیا۔ مولانا نے اس متاع کو عرش سے اٹھا کر پھر زمین پر لا رکھا۔ آسمان والے کہتے ہوں گے "شاباش! مال بہ پرشیں خاوند"

—— اور تو خیر ایک نظم "ہمارے کتے ٹیپو" پر بھی لکھی ہے۔ کوئی انگریز اگر اپنے کتے کا نام ٹیپو رکھے تو اس پر گلہ نہیں۔ لیکن ایک مولانا اگر اپنے کتے کو ٹیپو کہیں تو قومی غیرت اسے سن کر زمین میں گڑ جانا چاہتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ؏

اے عزیزان وا فر تمیز (یعنی اے سکولوں میں پڑھنے والے طالب علمو) اگر دیدہ عبرت نگاہ کی دولت سے محروم نہیں ہو تو مجھے دیکھو اور اگر گوشِ نصیحت نیوش کی نعمتِ عظمیٰ خوانِ قدرت سے آپ کو عطا ہوئی ہے تو میری سنو کہ میں بھی آپ لوگوں کی طرح ایک زمانہ تھا کہ سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں کی طرح اکثر دس کی بجائے سوا دس یا ساڑھے دس بجے سکول جایا کرتا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں کی طرح کبھی کبھی (اکیلا یا پانچ دس لڑکوں کو ساتھ لے کر) سکول سے غیر حاضر ہو جایا کرتا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں کی طرح ہمیشہ ماسٹر

صاحب یا ان کے لواحقین سے کے دشمنوں کی طبیعت کے علیل ہو جلنے کی دعائیں کیا کرتا تھا (میں بھی) آپ لوگوں کی طرح ہفتے کے چھ دن ہفتے کے ساتویں دن (یعنی اتوار) کی آمد کے لئے بقول شاعر بہ لبِ انتظار رہا کرتا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں کی طرح بسا اوقات کمرے کے کونے میں دیوار کی طرف منھ کرکے کھڑا ہونے یا بنچ پر کھڑا رہنے کو اپنی سرکردگی کی دلیل سمجھا کرتا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں کی طرح قریباً ہر روز سبق نہ یاد کرنے کی یاداشت میں ماسٹر صاحب کے طمانچوں کو اپنی سُرخروئی کا باعث خیال کیا کرتا تھا۔ پس پھرلے عزیزان وانرمیتیز جب وہ گذرا ہوا زمانہ مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ حسرت آٹھ آٹھ نو نو اور دس دس آنسو روتی ہے۔ اور دیدۂ حسرت کا حق ہے کہ دس دس نہیں بلکہ بیس بیس اور چھتیس چھتیس آنسو روئے۔ کیونکہ وہ زمانہ اب واپس نہیں آسکتا۔ اور آنے والا کوئی زمانہ اس زمانے کے برابر پُرلطف اور پُرکیف نہیں ہو سکتا۔ پس پھرلے عزیزان وانرمیتیز یہ اسی زمانہ کی بات ہے کہ ہم نے مولانا ممدوح کی یہ نظم (دال کی فریاد) سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔ اور ماسٹر صاحب کے ہر روز کے اصرار اور ان کی ہر روز کی مار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تمام کی تمام نظم یاد بھی کرلی تھی۔ کیا بتائیں کہ ان دنوں ہم کو اس نظم کے ساتھ کس قدر گہری دلچسپی تھی۔ اور اگر اسی قدر گہری دلچسپی نہ ہوتی تو آپ بھی اندازہ فرماسکتے ہیں کہ آج اتنا عرصہ گذر جلنے کے بعد ہمیں اس نظم پر شرح لکھنے کا خیال کیسے آتا؟

اس نظم میں جسے آپ ایک معمولی کہانی سمجھتے ہیں لغوی، اصطلاحی معنوی شاعرانہ اور فلسفیانہ حقائق و معارف کا ایک اتنا بیش بہا خزانہ بھرا پڑا ہے کہ اس کی شرح لکھنے کے لئے اگر روئے زمین کی تمام لوہے کی کانوں سے لوہا نکال کر نب بنائے جائیں اور بحرِ اوقیانوس میں کوئی کیمیاوی مصالحہ ڈال کر اسے بلو بلیک (ایک بنا ڈالا جائے تو بھی ایک وقت ایسا آئے گا کہ تمام نب گھس چکے ہوں گے اور تمام سیاہی ختم ہو گئی ہوگی لیکن یہ شرح پھر بھی تشنہ

تکمیل ہوگی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ادھر ہمارے علمی فضایل کی یہ کیفیت ہے کہ ہماری کم بضاعتی شہرۂ آفاق ہے یا کم از کم ہمیں اپنی تنک مائگی کا کامل اعتراف ہے۔ اندریں حالات ہم مجبور ہیں کہ ہماری یہ شرح نہایت ہی مختصر اور بالکل ہی نامکمل ہو۔ پس ہمیں اپنے محترم ناظرین سے پوری پوری امید ہے کہ وہ اپنے کریمانہ اخلاق کو برسرکار لاکر ہماری اس معذوری کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

پیشتر اس کے کہ ہم یہ شرح لکھنی شروع کریں ایک ضروری اور تمہیدی بات ناظرین کرام کو بتا دینی چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ گو یہ نظم (دال کی فریاد) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تصنیف شدہ ہے۔ لیکن کہانی مولانا موصوف کی تصنیف کی ہوئی نہیں۔ ناظرین یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اس کہانی کے مال مسروقہ ہونے پر ہمیں اُن دنوں میں بھی شک تھا جبکہ ہم نے یہ کہانی سکول کی ابتدائی جماعتوں میں پہلے پہل پڑھی تھی۔ ہمارے اس شک کے وجوہات اگرچہ اس وقت چنداں قابل اعتبار نہ تھے۔ تاہم یہ شک ہمارے دل میں نہایت مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہوگیا۔ اس کہانی پر سرقہ کا شبہ ہماری طبیعت میں اس طرح پیدا ہوا کہ (۱) دال حیوان ناطق نہیں (۲) حیوان غیر ناطق اور غیر حیوان یعنی جمادات و نباتات کی زبان سمجھنے کے صرف اولیاء اللہ اہل ہیں (۳) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اولیا اللہ میں سے نہیں ہیں۔ اس لئے اس کہانی کا حق تصنیف مولانا مذکور کے حق میں محفوظ نہیں ہو سکتا۔ گو ہمارے یہ دلائل قوی نہ تھے۔ لیکن یہ شبہ چونکہ اوائل عمر میں دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے بڑے ہو کر بھی زائل نہ ہو سکا۔ اللہ اللہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ طفلانہ شک کسی وقت ایک عظیم الشان علمی انکشاف کا باعث ہوگا۔

کچھ عرصہ سے ہماری طبیعت ریسرچ (علمی تحقیق) کی طرف بہت مائل ہوگئی ہے چنانچہ ہم

نے اس عرصہ میں قلمی اور غیر قلمی کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع کر لیا ہے اور اس فراہم شدہ مواد کی بدولت ہم نے تحقیق علمی کا ایک ایسا ہنگامہ خیز اور قیامت انگیز سلسلہ شروع کر رکھا ہے کہ جب اس سلسلے کے تحت لکھے ہوئے مقالات منصۂ شہود پر جلوہ پیرا ہوں گے تو دنیائے ادب میں ایک کہرام مچ جائیگا۔ اس سلسلہ میں ہم جتنا کام کر چکے ہیں اُس کا ایک ادنےٰ سا نمونہ یہ ہے کہ قوال کی فریاد والی کہانی کا مسروقہ ہونا جہاں کسی زمانے میں محض ایک خیال تھا آج ایک علمی حقیقت بن چکا ہے جو واقعات اس انکشاف کا باعث ہوئے انہیں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ناظرین کے استفادہ کے لئے یہاں بیان کرتے ہیں ؎

پروفیسر ..... کی صحبت کا نتیجہ سمجھئے کہ گزشتہ تین چار سال میں ہم نے دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کے صیغۂ فارسی کے سارے کیٹلاگ (فہرست) پڑھ ڈالے اس وسیع مطالعے نے ہم پر یہ چھپی ہوئی حقیقت واضح کر دی کہ حضرت مولانا روم قدس سرہٗ کی مثنوی کا کوئی ایسا نسخہ جو ساتویں صدی ہجری سے پہلے کا لکھا ہوا ہو کسی کتاب خانے میں موجود نہیں۔ نہ قلمی نہ کلکی نہ مطبوعہ۔ اس حقیقت پر جب ہم نے تجسس کی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ سکندر اعظم کی تاخت و تاراج کے وقت یا محمود غزنوی کے حملوں میں یا ہندوستانی فوجوں کی بغاوت کے ہنگامے میں مثنوی کے قدیم نسخے تمامتر تلف ہو گئے۔ کسی گوشۂ گمنامی یا طاقِ نسیاں میں پڑا ہوا کوئی نسخہ رہ گیا ہو تو معلوم نہیں۔

عالم علم و ادب کی بیدار بختی دیکھئے کہ گزشتہ مارچ جب ہم قلمی کتابوں کی تلاش میں شمالی پنجاب کا دورہ کر رہے تھے ہمیں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک پرانے علم دوست خاندان کا پتہ چلا۔ یہ گاؤں نزدیک ترین ریلوے اسٹیشن سے کم و بیش تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ موٹر کی آمد و رفت تو خیر دور کی بات ہے۔ رستہ ایسا دشوار گزار ہے کہ گھوڑے کی سواری بھی ممکنات سے نہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ لیلائے علم کے مجنوں محمل کی تلاش

میں رستے کی دشواریوں کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ اس راہ کی منزلیں طے کرنے میں ہمیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اُن کا اعادہ ہمارا یقین ہے کہ ناظرین کی طبیعت کی پراگندگی اور پریشانی کا باعث ہوگا۔ خدا خدا کرکے ہم منزلِ مقصود پر جا پہونچے اور مکان کا پتہ کرکے ایک فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت انسان کی صحبت سراپا برکت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کیا یہ بزرگ اگرچہ غدر دہلی کے وقت تین بیٹوں کے باپ تھے لیکن اب بھی قوائے جسمانی اور حواس ظاہری و باطنی اور شکل و صورت میں چالیس برس سے زیادہ عمر کے معلوم نہ ہوتے تھے مشرقی علوم کے ساتھ کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور گو علوم جدیدہ اور انگریزی سے بالکل بے بہرہ تھے لیکن حالاتِ حاضرہ کے معاشرتی اور سیاسی پہلو پر جب گفتگو کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا ایک دریا ہے جو ٹھاٹیں مارتا چلا جا رہا ہے۔ دو دن تک یہی پر لطف صحبتیں رہیں بالآخر ہم نے پرانی کتابوں کا ذکر چھیڑا فرمانے لگے کہ تیس سال سے کچھ اوپر کی بات ہے کہ ہم نے پڑھنا پڑھانا چھوڑا ہے۔ پھر کسی کتاب کو اٹھا کر نہیں دیکھا چند پرانی کتابیں گھر میں کہیں پڑی ہیں جاؤ انہیں دیکھو اور اگر کوئی کتاب مفید مطلب ہو تو لے جاؤ۔ میں انہیں اب کیا کروں گا۔ اشارہ کی دیر تھی کہ ہم بھوکے چیتے کی طرح اپنے شکار پر جا پڑے اور ایک دو گھنٹہ کی تلاش اور ورق گردانی کے بعد ہمیں مثنوی مولانا روم کا ایک پرانا نسخہ اور دو اور پرانی کتابیں مل گئیں۔ انہی کتابوں کے سر ورقوں پر "نذرِ ادیب" لکھوا کر اور نیچے اُن کے دستخط کروا کر ہم نے کتابوں کا تملیک نامہ گویا مکمل کرا لیا۔ اور پھر تھوڑی دیر ٹھیر کر اُن سے رخصت حاصل کی۔

یہاں آکر جب ہم نے دوبارہ ان کتابوں پر ایک محققانہ نظر ڈالی تو ہماری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ مثنوی مولانا روم کا یہ نسخہ غالباً دنیا کا قدیم ترین نسخہ تھا۔ جو اس گوشۂ گمنامی میں اس طرح صدیوں محفوظ اور پوشیدہ رہا۔ اس کتاب پر سنہ کتابت درج نہیں نہ کاتب کا نام لکھا ہے۔ ہم نے اس کتاب کے ایک ایک صفحہ کو نہایت عمیق نگاہوں سے

دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک صفحہ پر نہایت باریک قلم سے آدم الشعرا اُستاد رودکی کے ہاتھ کا ایک نوٹ لکھا ہوا ہے جس کے نیچے ان کے دستخط بھی موجود ہیں۔ اگر یہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا تو بھی اس نسخے کی قدامت دنیا کے تمام تر معلوم نسخوں کے مقابلہ میں اوّلیت کا تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ لیکن کسی اور ظاہری شہادت کی عدم موجودگی میں بھی قراین اور نہایت قوی قراین اس حقیقت پر دلالت کر رہے تھے کہ یہ نسخہ اُستاد رودکی سے بھی کئی صدی پہلے کا ہونا چاہیئے۔ رسم الخط، قلم، سیاہی اور حاشیہ کے نقش و نگار اور خصوصاً سر ورق کی طرح دیکھنے سے گمان ہوتا تھا کہ یہ نسخہ پچاس سال قبل مسیح سے ادھر کا نہیں ہو سکتا۔ بالآخر ہم کتابوں کی عمر دریافت کرنے کے فن کے آخری طریقہ کو استعمال کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ طریقہ گو بیحد خرچ اور بے انتہا محنت کا متقاضی ہے لیکن بالکل صحیح نتائج پر پہنچنے کے لئے اور کوئی وسیلہ بھی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ہم نے کتاب کے آخری صفحہ سے "تمت بعونہ تعالیٰ" کی عبارت کو دھو کر اس کا کیمیائی تجزیہ کیا۔ ایک مہینے کی لگاتار محنت اور ہزار ہا روپے کے خرچ سے آخر ہم نے معلوم کر لیا کہ جو سیاہی اس نسخہ کی کتابت پر خرچ ہوئی ہے وہ ۲۵۰ سنہ قبل مسیح سے بعد کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس سنہ سے بعد کی لکھی ہوئی کوئی کتاب اس سیاہی سے نہیں لکھی گئی۔ اس سیاہی کے بنانے کی ترکیب غالباً سینہ بسینہ اُس وقت تک آئی تھی اور بعد میں کسی وجہ سے ایسی ناپید ہو گئی کہ پھر مل نہ سکی حقیقت میں اس روشنائی کو سیاہی کہنا نادرست ہے۔ کیونکہ اس روشنائی کا رنگ موجودہ رنگوں میں سے کسی رنگ کے ساتھ کلی مشابہت نہیں رکھتا۔ اور نہ موجودہ رنگوں کے امتزاج سے ایسے رنگ کا پیدا ہونا سائنس کی رو سے ممکن ہے۔ اس رنگ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دن کی روشنی میں حروف کا رنگ اور ہوتا ہے اور چراغ کی روشنی میں بالکل اور۔ رنگوں کا یہ تغیر حاشیہ کے نقش و نگار میں عجیب کیفیات کا حامل ہے۔ دن کو دیکھو تو یہ نقش صرف پانچ رنگوں سے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ رات کو روشنی میں دیکھو تو اتنے مختلف رنگ نظر آئیں گے کہ ان کا شمار کرنا ناممکن ہو جائے گا

ایک رات ہم نے بڑی کوشش سے انیس رنگ گنے تھے۔ لیکن اس کے بعد اس قدر پریشانی پیدا ہوئی کہ زیادہ رنگ نہ گنے جا سکے۔ ہمارے ذخیرہ کتب میں بلکہ تمام دنیا کے معلوم شدہ ذخیرۂ کتب میں اس نسخہ سے زیادہ نادر اور بیش بہا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ ناظرین اگر فن کتابت اور فن نقاشی کے اس عنقا صفت نمونہ کو دیکھنا چاہیں تو ایڈیٹر نیرنگ خیال کی وساطت سے دیکھ سکتے ہیں۔

اسی نادر الوجود نسخے کی برکت ہے کہ ہم مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے سرقہ کو قطعی دلائل سے ثابت کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہم اسی نسخہ کی ورق گردانی کر رہے تھے جب کہ دفتر سوم میں دال کی فریاد والی کہانی زیادہ تر شرح و بسط کے ساتھ بعنوان ذیل ہماری نظر سے گزری۔

"تمثیل گریختن مومن و بے صبری او در بلا باضطراب و بیقراری تخود بجوش تا ہیزم ہا جہد دمنع کدبانو"

لوگ کہتے ہیں نقل را چہ عقل۔ ہم کہتے ہیں نقل را ہم عقل باید۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے کہانی چرائی تو ضرور لیکن نقل کرنے میں کہانی کو بالکل بے لطف اور ترتیب ترتیب بے معنی بنا دیا۔ شرح کے دوران میں ہم جا بجا اصل اور نقل کا بالاختصار مقابلہ کر کے ناظرین کو بتانے کی کوشش کریں گے کہ نقل کے لئے بھی عقل ضروری ہے۔ اور بہت ضروری۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں:۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال   دال کرتی ہے عرض یوں احوال

اس چھوٹے سے بظاہر آسان اور سادہ شعر میں مولانا موصوف نے لغوی، معنوی، تمدنی، سیاسی، فلسفیانہ اور شاعرانہ حقائق کا ایک اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(ایک) دنیائے اعداد کا یہ باوا آدم ہے۔ عدد اوّل اور عدد مطلق ہونے کی حیثیت سے

(ایک) ایک ایسا عنصر ہے جس سے عالم اعداد کی آفرینش عمل میں آئی - اگر (ایک) نہ ہوتا تو دو تین چار پانچ وغیرہ وغیرہ کی خلقت کیسے ممکن ہوتی - کیونکہ دو کیا ہے وہی ایک اور ایک - تین کیا ہے وہی ایک ایک اور ایک علیٰ ہذا القیاس تا منتہائے لا انتہائے اعداد - سائنس والے کسی زمانہ میں کہتے تھے کہ عنصر چار ہیں جن سے مادہ کی تخلیق ہوئی - بعد میں ان عناصر کو ترک کر کے اور عناصر بیان کئے جو سو یا سو سے زیادہ تک شمار ہوئے - اب اس زمانہ میں عناصر کی تعداد پھر کم ہو رہی ہے - ہم کہتے ہیں کہ عنصر صرف ایک ہے اور ایک ہی ہونا چاہیئے اور وہ وہی (ایک) ہے جسے خدا اور لالہ جی کے قول کو صحیح مانیں تو بھگوان کہتے ہیں - کائنات کے یہ تمام مظاہر سفلی و علوی اسی (ایک) کے ایک ارادے کے جلوے ہیں اور بس - اسی (ایک) کے ایک لفظ کے معانی ہیں اور فقط - اسے کلمۂ کُن کہئے یا کچھ اور - بات وہی ہے -

---

مولانا ممدوح نے یہاں لفظ (ایک) لکھ کر ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی کیا ہے جو ناظرین کی توجہ کے قابل ہے - وہ یہ ہے کہ مولانا نے دال بگھارنے پر صرف ایک لڑکی کو مقرر فرمایا ہے کیونکہ وہ عورت ذات کے خصائل عالیہ اور اس صنف کے نفسیات سے ناآشنا نہ تھے - اگر ایک سے زیادہ لڑکیوں کو دال بگھارنے پر بٹھا دیتے تو دال چولھے پر پڑی پڑی جل جاتی - کیونکہ لڑکیاں دال بگھارنے کی بجائے شوخی بگھارنی شروع کر دیتیں - اور اس بالمقابل شوخی بگھارنے میں وہ آپس میں لڑ پڑتیں اور گھر بھر کو سر پر اٹھا لیتیں - بچاری دال کو اس صورت میں کون پوچھتا کسی نے (بادنیٰ تغیر) کیا خوب کہا ہے :-

بہر جا جمع مے آیند عورات فسادات، فسادات، فسادات

ناظرین! عورات کی ترکیب جمعی اور حقیقت لغوی و اصطلاحی پر اعتراض نہ کریں - کیونکہ داناؤں نے کہا ہے کہ "گندہ بروزہ در حلوا اگرچہ گندہ است ایجاد بندہ است"

(لڑکی) آدم و حوا کی اولاد میں سے صنف نازک کے ایک ایسے فرد کا نام ہے جو

عمر میں ابھی بارہ چودہ سال سے زیادہ نہ ہو۔ سارداایکٹ سے پہلے یہ ضروری نہ تھا کہ یہ لڑکی صرف لڑکی ہو بیوی یا ماں نہ ہو۔ اب اس ایکٹ کی بدولت اتنا ہو گیا ہے کہ لڑکی صرف لڑکی ہے۔ نہ بیوی ہے نہ ماں۔ لیکن بعض مولانا صاحبان اور بعض پنڈت صاحبان بھی مصر ہیں کہ لڑکی کو لڑکپن میں ہی بیوی اور ماں بننے کی مشق کرانی چاہیئے۔ کیونکہ اگر اس عمر میں اس نے کچھ نہ سیکھا تو بڑی ہو کر کیا کرے گی۔ سبحان اللہ وبحمدہٗ۔

اصل کہانی میں مولانائے روم نے یہاں لڑکی نہیں لکھا۔ بلکہ کدبانو کہا ہے۔ ارباب بصیرت پر ظاہر ہے کہ اس تبدیلی سے معانی میں بڑا فرق پڑ گیا ہے چنانچہ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ جن فلسفیانہ حقائق و معارف پر یہ لڑکی لیکچر کرنے والی ہے وہ اس کے بس کے نہیں۔ نہیں ان کے لئے کم از کم کدبانو کی عمر اور تجربے کی عورت چاہیئے تھی۔ مخفی نہ رہے کہ کدبانو لڑکی سے عمر اور تجربے میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔

(بگھارنا) کسی ترکاری یا دال وغیرہ میں گرم مصالحہ یا پیاز لہسن گھی میں داغ کر کے ڈالنا یہ لغوی معنی ہیں۔ اصطلاح میں ترکاری اور دال پر ہی موقوف نہیں اور کئی چیزیں بھی بگھاری جا سکتی ہیں۔ مثلاً شیخی بگھارنا۔ یعنی اپنی تعریف میں یاوہ گوئی کرنا، فارسی اور ترکی بگھارنا یعنی خواہ مخواہ بلا ضرورت اپنی زبان چھوڑ کر دوسری زبان بولنا۔ ہندوستان میں اب کچھ مدت سے فارسی اور ترکی نہیں بگھاری جاتی۔ اکثر انگریزی بگھاری جاتی ہے اور ایسی گرم مصالحے ڈال کر بگھاری جاتی ہے کہ الاماں۔ اب تو لوگ انگریزی میں گفتگو ہی نہیں کرتے بلکہ ہنستے بھی انگریزی میں ہیں اور کھانستے بھی انگریزی میں ہیں اور جماہیاں بھی انگریزی میں لیتے ہیں یہاں تک کہ بعض آدمی باپ کے مرنے پر رونے بھی ہیں تو انگریزی میں۔

آجکل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی گفتگو کا انداز ملاحظہ ہو:۔

ڈپلومیسی سچ پوچھو تو ہپوکریسی کا دوسرا نام ہے۔ سٹریٹ فارورڈ آدمی تو پریزنٹ پولیٹیکل لائف میں کبھی سکسس فل ہو ہی نہیں سکتا۔ کامیاب لیڈر وہی ہے جو آن دی ون ہینڈ گورمنٹ سے ساز باز رکھے اور آن دی ادر ہینڈ اپنی قوم کو بھی فول بنا تا رہے۔ اور لیڈر بھی کیا کریں۔ وداؤٹ اگزیجریشن عرض کرتا ہوں کہ انڈین نیچر میں سلیوری اس قدر گھر کر گئی ہے کہ سپرٹ آف انڈی پنڈنس کا پیدا ہونا آلموسٹ امپاسیبل نظر آتا ہے۔ ایک طرف وانٹ آف ایجوکیشن ہے۔ اور دوسری طرف انفیریاریٹی کامپلکس۔ یہی ریزن ہے کہ ہندوستانی اتنے ڈیگریڈ ہو گئے ہیں کہ سویلائزڈ قومیں انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ علاوہ اس کے کمیونل ٹنشن اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر معاملے میں ہندو محمڈن کوسچن پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ہم فادرنز گورمنٹ کو کیونکر بلیم کریں۔ کہ وہ ڈیوائیڈ اینڈ رول کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے ہمیں چاہیئے کہ اپنی قوم کو ایجوکیٹ کریں۔ آرگنائز کریں اور ساؤنڈ پولیٹیکل لائنز پر ورک کرنے کی عادت ڈالیں اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو کہ انڈی پنڈنس مل گئی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انگریزی بگھارنا شرعاً منع ہے یا قانوناً جرم۔ البتہ اتنا عرض کئے دیتے ہیں کہ انگریزی بگھارتے وقت گرم مصالحوں کا فکر کرنا چاہیئے کہ کہیں ضرورت سے زیادہ نہ ہو جائیں۔

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(دال) فرہنگ نویس لکھتے ہیں اور بالاتفاق و بالاصرار لکھتے ہیں کہ دال اسم مؤنث ہے معلوم نہیں اس بیچاری نے مذکر ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا کہ فرہنگ نویسوں کو خاص طور پر یہ بتانا پڑا کہ دال مؤنث ہے مذکر نہیں۔ ہمیں تو دال خور قوموں کی تذکیر پر بھی شبہ ہے۔ دال کی تانیث پر اس اصرار کی کیا ضرورت تھی۔ دال سے مراد ہے دلے ہوئے چنے۔ مونگ، اُرد وغیرہ جو سالن کے طور پر پکائے جاتے ہیں۔

مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی یہ فروگذاشت ہرگز قابلِ عفو نہیں کہ آپ نے اس تمام کہانی میں کہیں یہ نہیں بتایا کہ یہ دال چنے کی ہے، مونگ کی ہے یا اُرد کی۔ حالانکہ مولانا مرحوم نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ اس کہانی کی دال چنے کی دال ہے۔ نہ مونگ کی ہے نہ ماش کی۔ نکتہ یہ ہے کہ نباتی مخلوق میں قوتِ گویائی سب سے زیادہ چنے کی دال میں پائی جاتی ہے چنانچہ دال خور حضرات اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوں گے۔ اس کہانی کو تمام تر پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ دال نے اپنے مصائب کا ایک مفصل تذکرہ بیان کیا ہے۔ بھلا چنے کی دال کے سوا اور کس دال میں یہ طاقت تھی کہ اتنی دیر تک بلا تکلف بولتی اور اس روانی سے بولتی چلی جاتی

مولانا فیروز آبادی نے کیا معلوم کس سند پر لفظ دال کے تحت یہ فقرہ لکھ دیا کہ "الدّال دالٌ علیٰ قلّت المال وکثرت العیال" یعنی دال دلالت کرتی ہے اس امر پر کہ دال کھانے والے کا مال تھوڑا ہے اور عیال زیادہ۔ گویا دال کھانا کثیر العیالی اور مفلسی کی دلیل ہے۔ آج تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی دال خور قومیں نہایت مالدار ہیں اور عیال کی کثرت کا یہ حال ہے کہ مردم شماری میں باقی قوموں کی نسبت کمی ہی دکھائی جاتی ہے۔ مولانا قاموس کے زمانہ میں ممکن ہے صورتِ حال دگرگوں ہو۔ آج کل تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ "الدالُ دالٌ علیٰ کثرت المال وقلّت العیال" اے عزیزانِ وافر تمیز! مخفی نہ رہے کہ دال جس کثرت سے ہندوستان میں کھائی جاتی ہے اور کسی ملک میں نہیں کھائی جاتی۔ اور بعض علمائے سیاسیات کی رائے ہے کہ ہندوستان کی ابدی غلامی کا باعث یہی عام دال خوری ہے۔ ایک ایرانی ماہرِ فن نے ہندوستانی معاشرت پر کیا مختصر اور پُر مغز تبصرہ فرمایا ہے۔ کہتا ہے غلّہ را بغلہ خورند دمے گویند دال مردوقی۔ جامہ را چرکیں دارند دمے گویند دھوتی ۔۔ ۔۔ را تا نیزہ کنند دمے گویند لنگوتی۔ معلوم نہیں ہندوستانی کب سمجھیں گے۔ سُن رہے ہیں کہ دنیا ان کی تضحیک کر رہی ہے لیکن کانوں میں غفلت کی رُوئی ڈالے بیٹھے ہیں گویا کوئی کچھ کہہ ہی نہیں رہا۔

دال کی تحقیر اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ دنیا کا اور کوئی کھانا جوتیوں میں نہیں بٹتا۔ دال جوتیوں میں بھی بٹتی ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی ہندوستانی گھر میں جاکر دیکھ لو۔ اور کسی کے گھر کیوں جاؤ اپنے ہی گھر میں دیکھو دال جوتیوں میں بٹتی ہے یا نہیں اور گھر پر ہی کیا منحصر ہے کونسل ہال میں دیکھو۔ پلیٹ فارم پر دیکھو۔ اخبارات کے کالم ملاحظہ کرو۔ ہر جگہ دال جوتیوں میں بٹ رہی ہے دال تو خیر یہ دال کا جوتیوں میں بٹنا جب تک ہندوستان میں باقی رہے گا ہندوستان آزاد نہ ہوگا۔ طرفہ تماشا ہوگا جب بمقام خاص لندن ڈاک خانہ ایضاً گول میز کانفرنس کے موقعہ پر شیخ جی اور پنڈت جی کے مابین دال جوتیوں میں بٹے گی جسے تمام دنیا کے لوگ دیکھیں گے اور ہنسیں گے۔ لارڈ جارج صاحب اس وقت ہندوستانیوں سے خطاب کرکے فرمائیں گے کہ اے عزیزان وافر تمیز! تمہی انصاف کرو کہ یہ قصور ہمارے پنیر بانٹنے کا ہے یا تمہارے دال بانٹنے کا۔ پس چہ مے فرمائند علمائے سیاسیات ہندوستان (از قسم مولانا و پنڈت و بنیا و کسان) بیچ بارے اس مسئلہ کے کہ کیا جواب دوگے تم سوالِ ہذا لارڈ جارج کے کا۔ بیّنوا و توجروا ؎

دال میں ایک اور عیب یہ ہے کہ اس میں اکثر کچھ کالا کالا بھی ہوتا ہے اور یہ کالا کالا صرف مونگ، ماش اور چنے کی دال میں ہی نہیں ہوتا بلکہ اور تمام دالوں میں بھی کبھی کبھی نظر آجاتا ہے جمعیت العلماء کی دال بھی کالے سے خالی نہیں۔ مسلم لیگ اور مہاسبھا کی دال تو بالکل ہی کالی ہے ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔

ایک اور خرابی جو دال میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ عام طور سے دال گلتی نہیں۔ ایک تو ہندوستانی دال کھائیں اور پھر دال گلی ہوئی بھی نہ ہو تو معدہ بچارا کیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ غریب ہندوستانیوں کی دال کہیں نہیں گلتی۔ میر انشاء اللہ خاں ولد میر ماشاء اللہ خاں ذات سیّد پیشہ شاعری عمر قریب پچاس سال ساکن دہلی حال لکھنؤ نے باقرارِ صالح ہندوستانی شیخ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے اور ہندوستانی پنڈت صاحب

کو سُناتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔

گلنے کی دال یاں نہیں بس خشکہ کھائیے　　اے شیخ صاحب آپ نہ شیخی بگھاریئے

مشہور مثل ہے کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔ یہ مثل چنے کی دال پر اور چنے کی دال کھانے والے ہندوستانیوں پر مساوی طور سے عائد ہوتی ہے۔ چنے کی دال نے جو فریاد کی تھی اس کا نتیجہ مولانا روم اور مولانا محمد اسمٰعیل نے بتا دیا۔ خود چنے کی فریاد کی کیفیت سنئے مولانا نذیر احمد دہلوی سابق ڈپٹی کلکٹر محکمہ بندوبست کی روایت ہے کہ

"چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں کہ ان کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جہاں میں نے زمین سے سر نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار ور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اس کو چکی میں دلیں۔ گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں۔ گھنگھنیاں پکائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح سے باکانہ چٹر پٹر بولنا سنکر حاضرین دربار اس قدر خوش ہوئے کہ ہر شخص اُسے کھانے کو دوڑا۔ چنا یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا"

ہندوستانیوں کی فریاد بھی کسی جگہ نہیں سُنی جاتی۔ کونسلوں میں فریاد کرنے جاتے ہیں تو وہاں وائسرائے صاحب قبلہ کی ڈیڈوا اور سرٹیفکیشن گلے پر ایسا ہاتھ رکھتی ہیں کہ پھر بولنا تو خیر دم لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ پلیٹ فارم پر فریاد کرتے ہیں تو تعزیرات ہند آنکھیں دکھاتی ہے

اخبارات میں کچھ لکھتے ہیں تو پریس آرڈیننس کی بدولت جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ سول نافرمانی کرتے ہیں تو سر پر ڈنڈے لگتے ہیں۔ اب ایک روز حضرت میکائیل کی خدمت میں وفد بھیجکر بھی دیکھ لیں۔ پس اے عزیزانِ وافر تمیز! ہندوستانی اگر چنے کی دال نہ کھاتے تو اس طرح کیوں لوہے کے چنے چباتے ؎

اس شعر میں ایک شاعرانہ صنعت بھی ہے وہ یہ کہ پہلے مصرع کا آخری لفظ اور دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ایک ہی ہے یعنی وہاں بھی دال ہے اور یہاں بھی دال۔ صنایع شعری میں معلوم نہیں اس صنعت کا کوئی خاص نام ہے یا نہیں لیکن صنعت دلچسپ ضرور ہے۔ اس دال کے ٹکڑانے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اس قسم کی صنعتیں بے ساختہ ہی پیدا ہو جاتی ہیں ورنہ یہ ادبی معجزے کوشش اور تصنع سے کبھی پیدا نہیں کئے جا سکتے۔

(عرض) شکر ہے کہ دال صرف عرض کرتی ہے اگر طول کرتی تو خدا جانے کلیات اسماعیل میں اور کسی نظم کی گنجائش باقی رہتی یا نہ۔ بہرحال دال کا عرض معلوم ہو گیا اگر طول معلوم کرنا ہو تو مثنوی مولانا روم کو ملاحظہ فرمایئے۔ اور پھر عرض اور طول کو ضرب دے کر دال کا رقبہ معلوم کر لیجئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے سرزمین ہندوستان کے مزروعہ رقبہ کی ایک تہائی سے کسی صورت میں کم نہ ہوگا لیکن دال بھی سچی ہے عرض نہ کرتی تو کیا اعتراض کرتی اور اگر اعتراض کرتی تو نتیجہ اس سے بھی بدتر ہوتا۔ صاحب غرض تھی اور مصیبت میں گرفتار تھی۔ اس لئے اعراض بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تعریض کا تو موقع ہی کیا تھا اور معارضہ کی اس میں طاقت ہی نہ تھی۔ تعرض اور تقارض بھی دال کی بساط سے باہر کی باتیں تھیں۔

آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان والے بھی محض اسی دال کی وجہ سے نہ کبھی اعتراض کرتے ہیں نہ اعراض۔ نہ تعریض کرتے ہیں۔ نہ معارضہ نہ تعرض کرتے ہیں اور نہ تعارض۔ جب کرتے ہیں عرض کرتے ہیں اور یہ عرض ایسی بے جوہر ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ ؎

(احوال) جمع ہے حال کی۔ اور حال اس کیفیت کا نام ہے جو زمانہ حال میں کسی چیز سے متعلق ہو اور اے عزیزانِ دافرتمیز! آپ کو معلوم ہے کہ زمانہ حال اس زمانہ کا نام ہے جو زمانہ ماضی اور زمانہ مستقبل کے درمیان ہوتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ زمانہ ماضی میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ بس ظاہر ہے کہ شاعر نے دال کی زبانی تمام تر قصہ گزشتہ روئداد کا بیان کیا ہے یعنی زمانہ ماضی کا تذکرہ کیا ہے زمانہ حال کی حالت پر صرف ایک شعر لکھا ہے لیکن بات یہ ہے کہ شاعر صاحب آخر سکول ٹیچر تھے اور ایک سکول ٹیچر سے قاموسیات پر اتنی عمیق نگاہ کی توقع کرنا انسانیت سے اگر بہت بعید نہیں تو چنداں قریب بھی نہیں ہو سکتا۔

اب سنئے کہ دال کرتی ہے عرض یوں احوال

ایک دن تھا ہری بھری کھیتی میں — ساری آفات سے بری کھیتی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ — وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
پانی پی پی کے کھیتی میں لہراتی — دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا جو کے آتے تھے — گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے
یہی سورج زمیں تھے ماں باوا — مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مجھ کو پال پوس بڑا — آہ ظالم کسان آن پڑا

اے عزیزانِ دافرتمیز! یہاں تک دال نے جو رونا رویا ہے وہ اپنی زرین ماضی کا تذکرہ ہے۔ ظالم کسان کے آن پڑنے تک جو جو خوشیاں دال نے دیکھیں انھیں رو رو کر بیان کر رہی ہے۔ ان اشعار میں چند الفاظ بلحاظ لغت قابل اعتنا ہیں۔ توجہ سے سنیں مزید تشریح آگے آئیگی۔

(دن) یہاں ایک دن سے مراد صرف ایک دن نہیں۔ بلکہ ایک زمانہ مراد ہے۔ سچ ہے خوشی میں گذرا ہوا زمانہ صرف ایک دن ہی نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں اوقات کی تعین میں دن سے عموماً دن رات مراد ہوتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں بات کو تین دن ہو گئے تو مراد تین دن

اور تین رات ہوتی ہے۔ دن اور رات میں چونکہ دن غالب ہوتا ہے اس لئے صرف دن کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح والد اور والدہ میں چونکہ والد غالب ہوتا ہے اس لئے ماں باپ کو والدین کہتے ہیں حالانکہ والدین کے معنی ہیں دو والد (دو باپ) اور دو والد کسی ہندوستانی کے نہیں ہوتے اسی طرح مشرق اور مغرب میں چونکہ مشرق غالب ہوتا ہے اس لئے مشرق و مغرب کو مشرقین کہتے ہیں۔ حالانکہ مشرقین کے معنی ہیں دو مشرق اور سرزمین ہندوستان میں سورج صرف ایک ہی طرف سے نکلتا ہے وقس علی ہذا ؛

(ہری بھری) سرسبز و شاداب، پرثمر وغیرہ وغیرہ۔ ہری بمعنی سبز اور بھری بمعنی بھری ہوئی یہ لفظ ہری بھی عجائب المخلوقات میں سے ہے۔ اس کے مختلف معنی سنئے۔ وشنو کا نام۔ کرشنا مہادیو۔ بھگوان۔ اندر۔ سانپ۔ مینڈک۔ گھوڑا۔ سورج۔ چاند۔ طوطا۔ بندر۔ جمراج۔ ہوا۔ برھما۔ شعاع۔ مور۔ کوئل۔ ہنس اور آگ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم ؛

دال جب تک ہری بھری تھی جائے میں نہیں سماتی تھی۔ اب ہری بولنا پڑا تو قدر عافیت معلوم ہوئی ؛

(وطن) دال کی (اور دال کھانے والوں کی) حبّ الوطنی ملاحظہ ہو۔ کہتی ہے وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا۔ کیوں نہ ہو وطن چیز ہی پیاری ہے۔ ہندوستانیوں کو بھی پیارا ہے ؛

(کسان) کاشتکار۔ کھیتی باڑی کرنے والا۔ دال کہتی ہے کسان ظالم ہے۔ کسان کہتا ہے ساری دنیا ظالم ہے میں مظلوم ہوں۔ اب فیصلہ کون کرے۔

دال کی داستان پاستان آپ نے سُن لی۔ اب ہندوستانیوں کی داستان پاستان خود ان کی زبان سے سنئے ؛

لالہ کرتے ہیں عرض یوں احوال

ایک دن تھا کہ میری قوم ہری بھری تھی (اب ہری ہر بول رہی ہے) ایک دن تھا کہ میری قوم ساری آفات سے بری تھی۔ (اب تو فرد جرم لگ چکی بری ہونا کارے دارد) ایک دن تھا کہ ہندوستا

کے ہرے بھرے کھیت میرا گہوارہ تھے (اب بھی ہرے بھرے ہیں لیکن غلہ باہر چلا جاتا ہے)
ایک دن تھا کہ یہ میرا وطن مجھے بہت پیارا تھا (ماشاء اللہ اب بھی بہت پیارا ہے کیا کہنے) ایک دن
تھا کہ میری قوم ہندوستان کے دریاؤں اور اس کی نہروں سے پانی پی پی کر لہراتی تھی۔ دھوپ
لیتی اور ہوا کھاتی تھی (اب ٹلکے کا پانی پیجئے اور غبار پھانکئے) ایک دن تھا کہ مینہ برستا تھا اور جھونکے
آتے تھے اور گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے (اب بھی مینہ برستا ہے اور جھونکے آتے ہیں لیکن اب
آپ بڑے ہوگئے۔ اس لئے گودیوں میں نہیں کھلاتے ہیں) ایک دن تھا کہ یہی سورج زمین
ماں باوا تھے اور مجھ سے نیک برتاؤ کرتے تھے۔ (اب بھی سورج اور زمین آپ کے ماں باوا
ہونے سے انکار نہیں کرتے لیکن آپ جو ناخلف ہوں تو وہ بیچارے کب تک نیک برتاؤ کریں)
جب مجھے پال پوس بڑا کیا تو افسوس کہ ظالم ... ...آن پڑا ... ظالم ہے یا آپ خود اپنی
جان پر ظلم کر رہے ہیں۔ لالہ جی آپ کے بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں ہیں۔ کھوپری میں مغز بھی ہے
کسی کو کیوں ظلم کرنے دیتے ہو)

شیخ کرتے ہیں عرض یوں احوال :-

ایک دن تھا ہم دنیا میں فاتح ہو کر نکلے تھے (وہ آپ کے باپ دادا تھے۔ ع۔ سلف ان
کے وہ تھے خلف ان کے یہ ہیں) ایک دن تھا کہ بحر و بر میں ہمارا سکہ رائج تھا (آج تو کوڑی کے
تین تین ہو) ایک دن تھا قیصر و کسریٰ ہمارا نام سن کر تھرا جاتے تھے (کیوں نہیں آج بھی آپ نے
یورپ میں جا کر شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ قیصر جرمنی تخت و تاج چھوڑ کر بھاگ نکلا ع
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند) ایک دن تھا کہ ہم یورپ کے کلیساؤں میں جا کر اذانیں
دیا کرتے تھے (اب کیا ہو گیا ہے۔ خاص مقابل لندن ووکنگ ماسک موجود ہے۔ جائیے اور
اذانیں فرمائیے۔ کون روکتا ہے) ایک دن تھا ہم نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دئے
تھے (ان بحری گھوڑوں کی نسل اب منقطع ہو چکی) ایک دن تھا کہ ہم نے اندلس کے کنارے
پہ پہونچ کر اپنے جہازوں کو آگ لگا دی تھی (وہ آگ اب بجھ چکی ہے جو جہازوں کو جلا دیا کرتی

ذُوالسیٹین

ہم نے اپنے شہر کی بڑی مسجد سے لے کر مشن کالج لاہور تک تعلیم پائی ہے چنانچہ ہم عوام کے نزدیک مولانا بھی ہیں اور بفضلہ تعالیٰ پنجاب یونی ورسٹی کے گریجویٹ بھی۔ بلکہ اگر القاب کا دارومدار صرف قابلیت پر ہو تو ہم اپنے نام نامی اور اسم سامی کے ساتھ فاضل دیوبند اور ایم۔ اے آکسن بھی لکھ سکتے ہیں۔ کسر نفسی سمجھیے کہ تاحال ہم نے اپنے سائن بورڈ پر صرف اسی قدر لکھوانے کا اکتفا کیا ہے:۔

"مولانا مِسٹر ... ... فاضل جامع مسجد ... ... و ایم۔ اے پنجاب عفی عنہٗ"

السنۂ شرقیہ و غربیہ پر ہم کو اتنا وسیع عبور ہے کہ اگر ہم ہفت زبان ہونے کا دعویٰ کریں تو یہ دعوائے بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ ہم نے ایک روز مجلس میں یہہ کہدیا کہ ہم سات زبانیں جانتے ہیں اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نہ رہ سکے اور تفصیل کے طالب ہوئے۔ ہم نے کہا (۱) پنجابی (۲) گورمکھی (۳) پشتو (۴) اردو (۵) فارسی (۶) انگریزی (۷) عربی۔ سامعین اس پر انگشت حیرت در دہاں ہو کر رہ گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہی صاحب مہر سکوت کو توڑ کر دبی زبان سے بول اُٹھے کہ حضرت گورمکھی کونسی زبان ہے ہم نے کہا وہی جو ملیچھے مالوے کے سکھ بولتے ہیں۔ اس پر سوائے اُن چند آدمیوں کے جو تنگ خیال کے ناظرین کی طرح سنجیدہ متین تھے۔ باقی لوگ خوب دل کھول کر ہنسے۔ اور مجلس گرم ہو گئی۔ ہم نے حضرت معترض کی خدمت میں عرض کی کہ

صاحب! فارسی عربی کو چھوڑ کر اور انگریزی کو ملا کر ہندوستان میں کوئی ایسا آدمی نہیں جس نے دو ضلعوں کا دورہ کیا ہو اور سات زبانیں نہ جانتا ہو۔ ہندوستانیوں کی اسی ہفت زبانی کی وجہ سے سات سمندر پار سے آکر ایک چھوٹی سی قوم برِ اعظم ہندوستان پر حکومت کر رہی ہے۔ زبان میں اتحاد نہ ہو تو خیالات میں یگانگت کہاں سے آئے اور خیالات میں یک رنگی نہ ہو تو ہم وم رد ل کیونکر نصیب ہو۔ الٰہی توفیق عطا کر کہ ہم یک زبان اور یک دل ہو کر شاہراہِ نجات پر گامزن ہوں۔

ان معترض حضرت کے اعتراض کے طفیل جملۂ معترضہ قدرے لمبا ہو گیا ہے اور وزن بیت سے باہر۔ اس لئے امابعد عرض ہے کہ ہماری دو طرفہ فضیلت یعنی عربیت اور انگریزیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم لغاتِ مغربی کو بازار کی بھاکھا میں اور کبھی کبھی حجاز کی بھاشا میں ضم کر دیں۔ چنانچہ ہماری اسی بد عادت کا نتیجہ ہے ہمارے اس مضمون کا عنوان جسے بعض لوگ تو سمجھ سکیں گے لیکن اکثر لوگ سمجھنے کے لئے مزید تشریح کے محتاج ہوں گے۔ ان موخر الذکر حضرات کا پاس خاطر ہمیں بہت ملحوظ ہے۔ اس لئے ہم اپنے تجویز کردہ یا تصنیف کردہ عنوان کی مفصّل شرح لکھے دیتے ہیں۔ اللّٰھم یسّر ولا تعسّر وتمّم بالخیر

پس بداں اے عزیز وافر تمیز کہ مے گوید بندۂ حقیر پُر تقصیر و فقیر پرانی لکیر کہ ذو بقول صاحب منتہی الارب (جسے عوام الناس جو گلستاں کو سعدی کی تصنیف سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ قاموس کا فارسی ترجمہ ہے۔ حالانکہ یہ قول بروئے تحقیقات جدیدہ بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے) لغت عرب ہے اور یہ لفظ نحوی ہچکولوں میں کبھی بصورت ذُو کبھی بشکل ذَا اور کبھی بہئیت ذِی جلوہ افروز ہوا کرتا ہے معنے اس کے ہیں صاحب یا مالک اور سلیس اردو میں کہیں تو والا یا والی مثلاً ذو معنی یعنی معنی والی بات اور ذو معنین یعنی دو معنوں والی بات

لیکن یہ دونوں قسم کی باتیں بہت کمیاب ہیں کیونکہ جو کچھ ہم کہتے ہیں یا سُنتے ہیں یا لکھتے ہیں یا پڑھتے ہیں اکثر بے معنی ہوتا ہے۔ اور محض بے معنی۔ یا مثلاً ذوالجوشن یعنی جوشن والا جو لقب ہے اُس مرد کا۔ جو باپ تھا اس نامرد کا جس نے قتل کیا اُس کو جو بیٹا تھا اُس کا جس نے توڑا تھا دروازہ خیبر کا (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) یا مثلاً ذوالنون یعنی مچھلی والا۔ جو لقب تھا ایک پیغمبر علیہ السلام کا جس کا ذکر قرآن میں آتا ہے اور نیز لقب تھا ایک صوفی علیہ الرحمت کا جس کا ذکر ہر ایک کتاب میں آتا ہے ؛

اُمید ہے کہ قارئین کرام اب اس لفظ کے مفہوم سے کماحقہٗ آشنا ہو چکے ہوں گے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس لفظ کا پیچھا چھوڑیں ایک لطیف نکتے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہو ہٰذا۔ جب ہم ایک زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پچھتر روپے ماہوار مشاہرہ پر اس عہدے پر متمکن تھے جس کے فرائض منصبی میں سب سے اہم یہ فرض ہے کہ علمی دنیا کے جتنے مسلمات ہیں ان کو غلط ثابت کیا جائے اور علی رغم الف حقایق ادبیہ و تاریخیہ و فلسفیہ وہ وہ نئی نئی باتیں تصنیف کی جائیں کہ فرزانان کے آگے سر تسلیم خم کرے اور بہتان کو نشش بجالائے یعنی بسبیل اختصار کا سچ چھوڑ کر جب ہم یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ہوئے تو پھر ہم نے اپنے تجسس و تحسس اور تحقیق و تدقیق کے زور سے ادبی دنیا میں وہ تہلکہ مچایا کہ مشرق و مغرب کی یونیورسٹیوں کے تمام گریجویٹ اور دیوبند و ندوہ کے تمام فاضل الامان الامان پکار اُٹھے۔ لیکن ہم نے یہ ثابت کر ہی دیا کہ عربی تمام زبانوں کی ماں نہیں بلکہ نانی ہے

اس ضمن میں ہم نے بتایا تھا کہ وہ ذوالنون یعنی مچھلی والا۔ اور ذوالذئب یعنی بھیڑیے والا۔ اور ذوالحمار یعنی گدھے والا اور ذوالاسد یعنی شیر والا۔ اور ذوالدب یعنی ریچھ والا۔ اور ذوالظبی یعنی ہرن والا۔ اور ذوالبقر یعنی گائے والا۔ اور ذوالشغبر یعنی گیدڑ والا۔ اور ذوالثعلب یعنی

لومڑی والا۔ اور ذوی الفیل یعنی ہاتھی والا۔ اور ذو القرد یعنی بندر والا اور ذو الایل یعنی بارہ سنگھے والا۔ اور ذو کلب الماء یعنی اودبلاؤ والا۔ یا اس والا جس کے وہ (جنید بیدستر کے نام سے) ہندوستانی دواخانہ دہلی والے سونے کے بھاؤ بیچتے ہیں اور ذو السلوی یعنی بٹیر والا۔ اور ذو العقعق یعنی شترمرغ والا۔ اور ذو الدراج یعنی تیتر والا۔ اور ذو الکعب یعنی بلبل والا۔ اور ذو العصافیر یعنی چڑیوں والا۔ اور ذو الصلصل یعنی فاختہ والا۔ اور ذو الحمامہ یعنی کبوتر والا اور ذو الشقراق یعنی نیل کنٹھ والا اور ذو الہدہد یعنی کٹھ بڑھئی والا اور ذو الحجل یعنی چکور والا۔ اور ذو الطاؤس یعنی مور والا۔ اور ذو اللقلق یعنی لگلگ والا۔ اور ذو النسر یعنی گدھ والا۔ اور ذو الببغا یعنی طوطے والا۔ اور ذو الغلان یعنی اس والا۔ اور ذو البہمان یعنی اس والا۔ یا اگر اس سے بھی مختصر کہیں تو وہ ذو الوحوش اور ذو الطیور یعنی ہر قسم کے درند والا۔ اور چرند والا اور پرند والا جو ٹھنڈی سڑک پر واقع ہے۔ اور جسے عوام الناس چڑیا خانہ اور سائنس پڑھنے والے لوگ ذو کہتے ہیں۔ دراصل یہی عربی ذو ہے۔ ع داد از دست ایں حقایق داد!

اسی طرح کے اور حقایق و معارف بھی ہم نے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیے لیکن جب ہمارا تھیسس بورڈ آف اگزیمنرز کے سامنے پیش ہوا تو وہ ہماری اس ریسرچ پر حسد کی آگ سے جل بھن گئے۔ ورنہ آج ہر ایک ڈی۔ لٹ یہ فخر کر سکتا کہ ہم بھی اُس کے اس لقب میں شریک ہیں۔

ہمارے عنوان کا دوسرا جزو ہے "السیٹین۔ الف لام تو تعریفی ہے جسے تمام فاضل دیوبند اور بعض بعض مولوی فاضل بھی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن سیٹین قدرے تشریح طلب ہے۔ یہ لفظ بہ صیغہ تثنیہ وہی لفظ سیٹ ہے جو ویبسٹر کی رائے کے مطابق لغت فرنگ ہے اور معنی اس کے ہیں "بیٹھنے کی جگہ" پس ذو السیٹین سے ہماری مراد وہ گاڑی ہے جس میں صرف دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہو یعنی ٹو سیٹر یا دو سیٹی گاڑی"

میرے ایک دوست اس بات پر معترض ہیں کہ کیوں میں نے سیٹ کو معرب کر کے سیت نہ بنا لیا۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ انگریزی لفظ کو معرب کر کے بگاڑ دینا انگریزی لفظ کی بے عزتی ہے اور انگریزی لفظ کی بے عزتی انگریزی زبان کی بے عزتی ہے اور انگریزی زبان کی بے عزتی انگریزی قوم کی بے عزتی ہے۔ اور انگریزی قوم کی بے عزتی برابر ہے ویجنگ وار کے برخلاف سلطان معظم کے۔ کہ جس جرم کے پاداش میں عدالتیں بڑا سنگین جرمانہ کرتی ہیں۔ اس لئے ہم نے مصلحت وقت کو سامنے رکھ کر ضروری سمجھا کہ اس لفظ کو جیسا ہے ویسا ہی رہنے دیں ؛

بعض احباب ہمارے اس طول تشریح سے ناراض ہوں گے لیکن ہمیں ڈر تھا کہ عدم تشریح کی صورت میں منگل سنگھ کو من کل شعتا پڑھنے والے مولوی صاحبان ہماری اس تصنیف شدہ ترکیب کو کہیں سے کہیں نہ لے جائیں ؛

خلاصۂ مطالب یہ کہ ہم ایک ایسی دو سیٹی موٹر کار کا ذکر کرنے والے ہیں جس کے مصنف اس عہد فرعونی کے مشہور قارون مسٹر فورڈ ہیں۔ ان حضرت نے جہاں لاکھوں موٹریں بنائی ہیں وہاں لاکھوں ہی لطیفے بھی تصنیف کرا دئے ہیں۔ گویا ان کی ساختہ پرداختہ ہر ایک موٹر کار ایک ایسا علمی اور عملی لطیفہ ہے جو بسا اوقات اعجاز کی سرحد تک جا پہنچتا ہے ؛

فورڈ کار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت ہلکی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک صاحب جو خوش قسمتی سے فورڈ کار کے مالک تھے گھر سے کار پر سوار ہوئے تیس میل تک موٹر خوب مزے سے دوڑتی چلی گئی۔ لیکن پھر یکایک ٹھہر گئی۔ ہر چند کوشش کی لیکن گاڑی سٹارٹ نہ ہوئی۔ اُتر کر انجن کا پردہ اٹھایا تو اُن کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پردے کے اندر کچھ بھی نہیں۔ یا مظہر العجائب گاڑی حاضر اور انجن غائب بات یہ تھی کہ اُن کے ڈرائیور نے اوور ہال کرنے کے لئے انجن گاڑی سے نکال لیا تھا۔

صاحب جو گھر سے گاڑی پر بیٹھے اور چکر کو ہاتھ لگایا۔ تو گاڑی اس ذرا سی تحریک سے حرکت میں آگئی۔ پھر کیا تھا چلتی بنی۔ اور برابر تیس میل تک چلتی ہی رہی۔ یہ گاڑی کے ہلکا ہونے کی برکت تھی ورنہ بھاری گاڑیاں جو اور کارخانے والے بناتے ہیں ایک میل بھی بغیر انجن کے نہیں چل سکتیں۔

ہم جس دیسی موٹر کار کا ذکر خیر کرنے والے ہیں وہ بھی ایک عجیب چیز اور ایک عجیب و غریب لطیفہ ہے۔ فورڈ کی اور گاڑیاں بھی ہلکی ہی ہوتی ہیں لیکن یہ گاڑی تو بس ایک پھول ہے جو ہاتھ لگانے سے ہلتی ہوتی ہے اور فقط انگلی کے اشارہ سے چل کھڑی ہوتی ہے اور گاڑیوں میں سیلف سٹارٹر کے پرزے لگے ہوتے ہیں لیکن یہ گاڑی بغیر کسی ایسے پرزے کے لفظاً و معناً سیلف سٹارٹر ہے یعنی خود بخود چل نکلتی ہے اس حسین و جمیل گاڑی کے مالک ہمارے ایک دوست ہیں جو زیادہ تر دیوانی کام کرتے ہیں اور کبھی کبھی فوجداری بھی۔ یہ صاحب گو صوفی منش ہیں لیکن بڑے ضدی ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ ان کی اس چھوٹی سی خوبصورت گاڑی کو خواہ اُسے گاڑی کہیں خواہ موٹر ہمیشہ بصیغۂ تانیث ہی یاد کیا جائے۔ ان کے پاس خاطر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس امر میں التزاماً اُن کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لئے ہم اُن کی موٹر کو اُن کی موٹر ہی کہیں گے۔ نہ کہ اُن کا موٹر۔ یہ صاحب رہنے والے بھی اس ملک کے ہیں جس میں تذکیر و تانیث کی تفریق مفقود ہے۔ چنانچہ اُن کے ہموطن کہیں گے: "یہ لڑکا سکول میں پڑھتی ہے" اور "وہ لڑکی بڑا عقلمند ہے" وغیرہ وغیرہ

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

پہلے آپ کے پاس ایک گھوڑی ٹانگہ تھا۔ گھوڑی اور ٹانگہ دونوں پانچ سو روپے میں فروخت کر دئے۔ اور یہ موٹر ساڑھے تین سو روپے میں خرید لی۔ ڈیڑھ سو روپیہ بھی

بچہ لیا اور بجائے تانگہ کے موٹر کے مالک بھی بن گئے۔

اُن کی اس گاڑی پر مسٹر فورڈ کے اصول موضوعہ کے مطابق صرف دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں یا بالفاظ دیگر ڈرائیور اور کلینر دونوں بیٹھ جائیں تو ایک آدمی بھی اس گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتا چونکہ یہ صاحب فطرتاً اصول کے بہت پابند ہیں اس لئے گاڑی میں ہمیشہ بیٹھتے بھی صرف دو آدمی ہیں یعنی ایک خود بہ دولت اور دوسرا ان کا ایک نوکر۔ گو ان کی موٹر کے پیچھے لگیج کیریئر کی بجائے قبر کی ہم شکل ایک چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی ہے۔ اور روایتاً یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ جگہ بوقت ضرورت تیسرے آدمی کے بیٹھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ لیکن یہ جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے کیونکہ کوئی آدمی اس میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا اور اس جگہ بیٹھنے سے قبر میں لیٹنا زیادہ آرام دہ خیال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ گاڑی اوور لوڈ ہونے کی بجائے ہمیشہ انڈر لوڈ ہی رہتی ہے۔ چونکہ یہ موٹر اوّل تو خود ہی بے حد ہلکی ہے۔ اور پھر بوجھ بھی اس پر اندازہ سے کم ہوتا ہے۔ اس لئے دفتر سے گھر تک اور گھر سے دفتر تک بغیر پٹرول کے ہی آتے جاتے ہیں۔ البتہ دفتر آتے ہوئے موٹر کے ساتھ ساتھ ایک اردلی کو آنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اُن کا دفتر سطح سمندر سے ان کے گھر کی نسبت ایک فٹ زیادہ بلند ہے۔

لمبے سفر پر البتہ یہ گاڑی پٹرول سے چلتی ہے کیونکہ ایسے سفر میں ایک تو اردلی ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اور دوسرے سپیڈ کا خیال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ موٹر کئی لمبے سفر طے کر چکی ہے اور ریلوے سٹیشن تک جو یہاں سے نو میل اور سفر خرچ کی اغراض کے لئے پورے دس میل دُور ہے۔ دو دفعہ ہو آئی ہے۔ اور لطف یہ کہ دونوں دفعہ اپنے ہی پہیوں پر پٹرول کے زور سے آتی جاتی رہی۔ نہ کبھی کسی موٹر ٹرک پر لادنی پڑی اور نہ ہی اسے گھر پہونچانے کے لئے کبھی بیل جوتنے پڑے۔

لیکن اس گاڑی کا سب سے بڑا کارنامہ جو موٹر کاروں کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ ہے کہ گزشتہ کرسمس میں یہ گاڑی یہاں سے چل کر پشاور۔ بنوں اور کوہاٹ ہوتی ہوئی ڈیرہ اسمعیلخان جا پہونچی۔ اور یہ تمام رستہ صرف پانچ دن میں طے کر لیا حالانکہ تیز سے تیز گھوڑی والا تانگہ اس سفر کو پورے چھ دن میں طے کرتا ہے ؛

اس موٹر کے لمپ ڈاکٹری کی موجودہ ترقی یافتہ سائنس کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گیس اور بجلی کی روشنی نے جو ہمیشہ تیز اور چندھیا دینے والی ہوتی ہے لوگوں کی نظروں کو خراب کر دیا ہے اور یہی سبب ہے کہ پرائمری سکولوں کے طالب علم بھی اکثر عینکیں لگائے پھرتے ہیں۔ اسی قباحت کو دور کرنے کے لئے اس گاڑی کے لمپ ایسے مدھم بنائے گئے ہیں کہ ہماری میونسپل کمیٹی کے لمپوں کی طرح جب تک لمپ کا ڈھکنا کھول کر منہ اندر نہ ڈالا جائے یہ معلوم بھی نہیں ہو سکتا کہ لمپ روشن ہے یا نہیں ؛

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر لمپ اتنے مدھم ہیں تو دور سے آنے والے کو کیونکر معلوم ہو سکے گا کہ سامنے سے کوئی موٹر کار آ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گاڑی کے موجد نے اس کمی کو بہ احسن وجوہ پورا کر دیا ہے وہ اس طرح کہ چلتے وقت اس گاڑی کا انجن اس کی مشین۔ اس کے تمام پرزے حتیٰ کہ اس کی باڈی یہ تمام چیزیں بلکر ایک ایسا ترنم خیز ہارن بجاتی رہتی ہیں کہ سڑک پر چلتے وقت سامنے آنے والے لوگ تو کیا۔ دو دو تین تین میل تک کے دیہات کے لوگ بھی سنتے اور سمجھتے ہیں کہ فلاں صاحب کی موٹر آ رہی ہے۔ گاڑی کے اس لاجواب ہارن میں موجد نے اس قدر موسیقی بھر دی ہے کہ

درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی متاثر ہو کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس موٹر نے اب تک یعنی مسٹر فورڈ کا کارخانہ چھوڑنے سے لیکر ہمارے دوست کے پاس آنے تک جو بشمار تسلسل اس کے گیارھویں اور اگر مسٹر فورڈ کو بھی شمار کیا جائے تو اس کے بارھویں مالک ہیں۔ ایک ایکسیڈنٹ بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس گاڑی کو چلانے والا کوئی شخص کبھی موٹر وہیکل ایکٹ میں چالان ہوا ہے۔ بعض لوگ حسد کی وجہ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ گاڑی موٹر وہیکل کی تعریف میں نہیں آتی لیکن ع حسود را چہ کنم او بخود برنج دراست۔ ورنہ موٹر وہیکل کا لفظ اس گاڑی پر اس قدر مکمل طور سے چسپاں ہوتا ہے کہ عجب نہیں کونسل والے ممکن ہے مستقبل قریب میں اس لفظ کی تعریف کے ساتھ مثال کے طور پر اس گاڑی کا ذکر بھی کر دیں۔ وجہ یہ ہے کہ کسی لفظ کی محض تعریف ہی کر دینا بسا اوقات ناکافی ہوتا ہے اور بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے مثال کی ضرورت ہوتی ہے اور مثال یقیناً ایسی ہونی چاہیئے جسے عام لوگ جانتے ہوں۔ آپ کی گاڑی کو پہلے سے ہی ایک دنیا جانتی ہے اور اب نیرنگ خیال کے پانچ ہزار خریدار اور ان کے علاوہ پندرہ ہزار مفت پڑھنے والے اصحاب بھی اس گاڑی سے آشنا ہو چکے ہیں۔ پھر انصاف کا مقام ہے کہ اس گاڑی سے بڑھ کر کونسی عام فہم مثال پیدا کی جا سکے گی۔

اس کار کے مالک اپنی اس ذواسٹیئین کی نہایت احتیاط سے غور پرداخت کرتے ہیں اس کو کبھی میلا نہیں ہونے دیتے اور اس کے استعمال کے متعلق اتنا بخل کرتے ہیں کہ ہم کو بھی جو ان کے بڑے مہربان دوست ہیں کبھی سواری کی دعوت نہیں دی۔ مبصرین فن کی رائے ہے کہ اگر اس گاڑی کو اسی طرح سنبھال کر رکھا گیا تو وہ اور تیس سال تک خراب نہیں ہو سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم اس گاڑی کی عمر اس سے بھی زیادہ کرے

آمین۔ ثم آمین۔ فثم آمین

آڑو[1]

(۱)

کچھ اوپر تین سال کی بات ہے کہ راولپنڈی کے لالہ پیارے لال جو ایک معزز خاندان کے فرد ہیں۔ گھی کی تجارت کرتے ہیں اور میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی ہیں ایک روز بازار سے آڑو کھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بھگت کندن لال کی دوکان کے سامنے سے جا رہے تھے کہ اتفاقاً بھگت صاحب کے لڑکے نے جو ابھی آڑو خرید کر لایا تھا ایک آڑو سامنے والے دوکاندار کے لڑکے کی طرف پھینکا۔ اور کہا کہ "لو آڑو آیا ہے" لالہ پیارے لال کچھ چونکنے سے ہو گئے اور گھبرا کر بھگت صاحب کے لڑکے کی طرف دیکھا۔ آپ کی آنکھیں خشمگیں ہو گئیں۔ چہرہ تمتما گیا۔ اور نبض کی رفتار معمول سے تیز ہو گئی۔ آپ نے سمجھا کہ لڑکے نے شاید ان کے بازار میں آڑو کھانے کی بدتمیزی پر ان پر مزاح اڑایا ہے۔ آپ بھگت صاحب کی دوکان پر آئے لڑکے کو ڈانٹا ڈپٹا اور اس کی بداخلاقی پر اسے برا بھلا کہا اور چلے گئے۔ لڑکا پہلے تو کچھ ششدر سا ہو گیا۔ کہ یہ ماجرا کیا ہے اور لالہ صاحب کیوں اتنے گرم اور ترش ہو گئے ہیں لیکن معاً اسے لالہ صاحب کی غلط فہمی کے وجوہ کا کچھ دھندلا سا خیال آ گیا۔ اور حقیقت حال کو سمجھ گیا۔ پھر کیا تھا دیوانہ را ہوئے بس است۔ بچوں کی طبیعت کی شرارت آمیز شوخی سے شیطان جیسا اگرگ کہن بھی کان پکڑتا ہے۔ لالہ صاحب بچارے کی تو اوقات ہی کیا تھی۔ وار پار کے دونوں شریر لڑکوں میں اس واقعہ کا دیر تک چرچا ہوتا رہا۔ لالہ صاحب کی بدقسمتی دیکھئے۔ کہ واپسی پر پھر اسی بازار سے ہو کر گزرے۔ جب نزدیک پہنچے

[1] تمام نام اور مقام فرضی ہیں۔ ایڈیٹر

تو سامنے کی دوکان والے لڑکے نے بھگت صاحب کے لڑکے کی طرف آرڈو پھینکا اور کہا کہ "لو آرڈو واپس آیا ہے۔ لالہ صاحب پہلے سے ہی جلے بھنے تھے۔ یہ سُنکر آگ بگولا ہو گئے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکا بن کر بازار میں وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کیا کہ الامان۔ بازار کے تمام دوکاندار اکٹھے ہو گئے۔ اور لڑکوں کا تو ایک میلہ ہی جمع گیا۔ لالہ صاحب کے سر پر غصّے کا جن سوار تھا۔ پاگلوں کی طرح گالیاں دیتے تھے اور وہ وہ لغات استعمال کرتے تھے کہ فرہنگ آصفیہ کا مصنّف بھی شرما جائے۔ اور قاموس والا بچارا بھی پانی پانی ہو جائے لوگوں نے لالہ جی کو ہزار سمجھایا بجھایا۔ مگر اُن کا نشہ اُترنے میں نہ آیا۔ اتنے میں مجمع میں سے ایک لڑکے نے بلند آواز سے پکارا "آرڈو" یہ سُنکر سیکڑوں لڑکے جو وہاں جمع تھے بیک آواز پکار اٹھے۔ "آرڈو۔ آرڈو" بس پھر خدا دے اور بندہ لے۔ لڑکوں کی فوج نے آرڈو۔ او۔ آرڈو" کے نعروں سے بازار سر پر اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر میں راولپنڈی کے تمام بازاروں اور گلی کوچوں میں یہ وبا پھیل گئی۔ جس طرف جاؤ۔ لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر یہی بے معنی نعرہ لگاتے تھے اور پھر کھلکھلا کر ہنستے تھے۔

اُدھر لالہ پیارے لال گھر تو پہنچ گئے۔ مگر دن بھر طبیعت بے چین رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ دو تین روز گھر والوں نے انھیں باہر نکلنے سے روکا لیکن تا بکے۔ آخر ایک دن گلی میں نکلے۔ تو دو لڑکے جو گولیاں کھیل رہے تھے انھیں دیکھ کر آرڈو۔ او۔ آرڈو۔ او۔ کہتے ہوئے بھاگ گئے۔ آپ اُن لڑکوں کے پیچھے گالیاں دیتے ہوئے تھوڑی دور تک بھاگے مگر لڑکے ہاتھ نہ آئے۔

حاصل کلام یہ کہ آجکل لالہ پیارے لال شہر کے پاگلوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کاروبار بند پڑے ہیں۔ بمبری سے بھی علیحدہ ہو چکے ہیں اور صورت حالات یہ ہے کہ وہ لڑکوں کو دیکھتے ہی گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں اور لڑکے اُن کو دیکھتے ہی آرڈو۔ او۔ آرڈو پکارنے لگ

جاتے ہیں۔

(۲)

لڑکوں نے جو یہ اصطلاح نکالی تو چند روز تک تو لالہ پیارے لال سے ہی مخصوص رہی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کا اطلاق عام ہوتا گیا۔ اور ساتھ ہی جہاں یہ لفظ بے معنی گنا جاتا تھا۔ ہوتے ہوتے اب ایک نہایت کثیر المعانی اور پُر مغز لفظ بن گیا۔ اب لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر بھی آرڈو او۔ آرڈو۔ او پکارنے لگ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آجکل سلام اور بندگی موقوف ہے اور بے تکلف دوست جب ملتے ہیں تو فریقین میں صرف آرڈو او آرڈو او کا تبادلہ ہوتا ہے اور بس۔ صرف لڑکوں پر ہی منحصر نہیں بلکہ بڑے بڑے معمر۔ سنجیدہ اور جہاندیدہ لوگ بھی اکثر اوقات مزاحاً ایک دوسرے کو آرڈو۔ او۔ آرڈو۔ او کہدیتے ہیں۔ یہ لفظ جن جن معنوں میں ان دنوں استعمال ہوتا ہے ان کی مثالیں سُنئے۔ اور اس کے ایجاد کرنے والوں کی ذہانت اور جدت کی داد دیجئے۔

(۳)

پارسال اگست کے مہینے میں یہاں دو مقامی سکولوں کی ٹیموں میں فٹ بال کا میچ ہوا۔ ایک صاحب جو کالج کے زمانے میں فٹ بال کے مشہور کھلاڑی رہ چکے تھے۔ ریفری مقرر ہوئے اطفال کی کھیلوں میں ریفری کا کام کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ بدقسمتی سے ریفری صاحب نے ایک ٹیم کے خلاف دو تین فاؤل دیدیئے۔ ٹیم مقابلتہً کمزور بھی تھی۔ بالآخر ہار گئی۔ میچ کے ختم ہونے پر ریفری صاحب گھر کو روانہ ہوئے۔ تو پیچھے ہارے ہوئے سکول کے لڑکوں نے جو صدہا کی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ آرڈو او۔ آرڈو او۔ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ریفری صاحب جھینپتے ہوئے کان دبائے سیدھے نکل گئے۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اگر دیکھ ہی لیتے اور کچھ کہہ بھی بیٹھتے تو آج وہ بھی لالہ پیارے لال کی طرح کام کاج چھوڑ کر باضابطہ اور سند یافتہ آرڈو بنے ہوتے رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

ہمارے شہر کے ایک مفتی صاحب (یو۔ پی کے رہنے والے) جو۔ تون محکمہ سپلائی و ٹرانسپورٹ میں ایک اچھے عہدے پر ملازم رہے ہیں۔ عدم تعاون کے دنوں سے بوجوہات چند درچند نوکری چھوڑ کر خانہ نشین ہو چکے ہیں۔ بڑے پایہ کے بد دیانت اور پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ شہر کے لوگوں کی رائے ہے کہ وہ سو فیصدی جھوٹ بولتے ہیں اور بعض لوگ بنظر احتیاط کہتے ہیں کہ آپ ایک سو ایک فیصدی جھوٹ بولتے ہیں۔ کمال فن ہے۔ اگلے وقتوں کے بزرگ یونہی تو نہیں کہتے گئے ؏ کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ چنانچہ آنجناب بھی بہت ہردلعزیز ہیں اور اپنے اس فن میں صاحب کمال ہونے کی وجہ سے رائے عامہ نے آپ کو "مُسیلمہ کذاب" کی ترکیب کے تتبع میں "کذاب اعظم" کا لقب دے رکھا ہے۔ عہدِ ملازمت میں آپ کی بد دیانتی شہرۂ آفاق تھی۔ البتہ ان کی چالاکی ان کی بد دیانتی پر فوقیت لے گئی اور وہ کبھی پکڑے نہ گئے۔ بڑی جائداد کے مالک ہیں اور اسے اپنے پسینے کی کمائی بیان فرماتے ہیں۔ ایک روز بزم احباب میں بیٹھے حسب معمول گپیں ہانک رہے تھے۔ کہ فرمانے لگے "میں عراق عرب سے واپس آیا تو تین عرب سردار جو محکمہ سپلائی کے ٹھیکیدار تھے سٹیشن پر مجھے الوداع کہنے آئے۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے تیس ہزار روپیہ کے نوٹ میرے پیش کئے اور کہا کہ یہ آپ کی خوش اخلاقی اور دیانتداری کا صلہ ہے۔ میں نے انکار کیا۔ انھوں نے اصرار کیا۔ لیکن جب آخرکار انھوں نے دیکھا کہ میری ضمیر اس رقم کے لینے سے قطعی انکار کر چکی ہے تو اُن میں سے ایک نے مجھ پر پستول سیدھا کیا اور کہا کہ اگر آپ یہ روپیہ نہ لے کر ہماری توہین کریں گے تو میں آپ کو گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ مجبور ہو کر میں نے وہ نوٹ لے لئے اور جیب میں ڈال کر روانہ ہوا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء" یہ تقریر سنکر سامعین میں سے ایک نے دوسرے کے کان میں آہستہ سے کہا کہ مفتی صاحب بھی پورے آرٹسٹ ہیں؛

(۵)

بنوں کے ایک خان صاحب جو چند یوم سے یہاں مقیم ہیں۔ بڑے موٹے جسم اور بڑی موٹی عقل کے انسان ہیں۔ زبان اتنی صاف ہے کہ کوئی حرف بھی صحیح قرأت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے۔ ایک روز اکابر شہر کی شکایت کر رہے تھے کہ وہ کسی معاملہ میں ہم سے مشورہ نہیں کرتے۔ فرمانے لگے کہ " شالے ہم کو پوچھتے ہی نہیں۔ کیا ہم شہر کے ریچھ نہیں ہیں " یعنی سلے ہم کو پوچھتے ہی نہیں کیا ہم شہر کے رئیس نہیں ہیں؟

حاضرین پر اس طلاقت لسانی اور خوش مذاقی کا بڑا اثر ہوا۔ اور ایک صاحب کہنے لگے کہ یہ حضرت بھی اچھے خاصے آرڈو ہیں ؛

(۶)

پچھلے ہفتہ مقامی انجمن ارباب سخن کی سرپرستی میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ ہمارے پڑوس میں ایک ملک الشعراء رہتے ہیں جو یادہ گوئی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے وہ بھی مدعو تھے۔ آپ تبدیل آب و ہوا کے لئے اکثر پہاڑی مقامات پر تشریف لے جایا کرتے ہیں چنانچہ آپ نے اپنا ایک منظوم سفرنامہ سنایا۔ پڑھنے کا انداز بالکل نرالا تھا جو لکھنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا ہے ڈھونڈا! :

ہم ایک دن
سیاح بنے
سر بن کی چو۔
۔ ٹی پر چڑھے
راجہ ر سا۔
۔ لو کی کلاں
دلدائے صد

راز نہاں
دیکھی تو ہم۔ گھبرا گئے
کھانا پکا
تھا تر بتر
احباب سا-
-رے بیٹھ کر

ہنسنے لگے
کھانے لگے
بھینسوں کو شر-
-مانے لگے
سارے کا سارا کھا گئے
اتنے میں سو-
-رج ڈھل گیا
یعنی بہت
ناوقت تھا

اک شارٹ کٹ
کے راستے
اترے بہت
تکلیف سے

گویا کہ واپس آگئے

حاضرین میں سکولوں کے بیشمار لڑکے موجود تھے۔ ایک ایک مصرعہ پر بلکہ ایک ایک نیم یا ربع مصرعہ پر آرڈوا د۔ آرڈواد کے وہ فلک شگاف نعرے لگتے تھے کہ خدا کی پناہ صدر مشاعرہ نے بڑی مشکل سے لڑکوں کو نعرے لگانے سے منع کیا اور ملک الشعراء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ حضرت اگر آپ آرڈو نہ ہوتے تو یہاں تک نوبت نہ پہنچتی ؛

(۷)

اس سنئے لفظ نے صرف روزمرہ اور نثر ہی میں دخل حاصل نہیں کیا۔ بلکہ لغات اردو کا یہ مدّ میں اب بڑی بڑی بلند پایہ اور آبدار نظموں میں بھی پرو دیا جانے لگا ہے چنانچہ شہنشاہ شعرائے حال۔ سخن سنج بے مثال صاحب صد فضل و کمال مولانا برہان الدین خاں المتخلص بہ جاؔل فرماتے ہیں ؎

رند میکش سے لڑ پڑا واعظ
یہ بھی آرڈو ہے وہ بھی آرڈو ہے

(۸)

ہم یہ مضمون یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے ایک دوست تشریف لائے۔ اور مضمون دیکھنے پر مصر ہوئے۔ چار و ناچار ہم نے مسودہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔ پڑھ کر فرمانے لگے کہ "جناب من! آپ ان سب سے بڑھ کر آرڈو ہیں" ؛

(۹)

آج سے کئی سال بعد جب محققان فن لغات اور جمع آوران مصطلحات اردو زبان کی کوئی بسیط فرہنگ مرتب کرنے کا تہیہ کریں گے تو اس تحقیق کے پیش نظر نہ ہونے کی صورت میں سوائے اس کے اور کیا کریں گے کہ لفظ آرڈو کے نیچے کچھ اناپ شناپ لکھ کر بحث کو تشنہ چھوڑ کر آگے نکل جائیں لیکن اس سے بھی کئی سال بعد جب یورپ

کا کوئی مستشرق یا ہندوستان کا کوئی ریسرچ سکالر برٹش میوزیم لائبریری کے شیلفوں کی پڑتال کرتے کرتے نیرنگ خیال کا یہ پرچہ دیکھ پائیگا تو دنیائے ادب میں ایک تہلکہ مچ جائے گا۔ اور انگلستان اور ہندوستان کے تمام علمی رسالے اور ادبی مجلے کئی سال تک لالہ آرڈ کی سرگزشت کے اس انکشاف پر تنقیدیں اور تبصرے لکھتے رہیں گے

عید مبارک

تو پاس ہو تو ہے مرا ہر روز روز عید ÷ تیرے بغیر عید بھی یوم النشور ہے

اس شعر کے کہنے والے کی طرف سے (خواہ وہ کوئی ہو اور خواہ کہیں ہو) اس کو جسے مخاطب کرکے یہ شعر کہا گیا ہے عید مبارک!

کیا خوب کہا ہے غالب دہلوی نے: ایک سوگیارہ روپے والے مرقع چغتائی میں۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نیرنگ خیال کے مستقل خریداروں کو (یعنی اُن کرم النفس اصحاب کو جو سالانہ وی۔ پی وصول کرنے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں اور غیر مستقل خریداروں کو یعنی اُن لوگوں کو جو ایجنٹوں اور ریلوے بک سٹالوں سے خرید کر رسالہ پڑھتے ہیں) اور اُن مستقل مزاج ناظرین کو جو ہمیشہ رسالہ پڑھتے ہیں اور ہمیشہ چرا کر یا اُڑا کر یا مانگ کر پڑھتے ہیں (اور ایسے لوگوں کا دم بھی ہندوستان میں غنیمت ہے) عید مبارک!

ان رسالوں کے مستقل خریداروں اور غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو کبھی عید نمبر شائع نہیں کرتے اور عید نمبر یا کوئی اور خاص نمبر شائع کرنا شعلۂ اسلامی کے منافی خیال کرتے ہیں اور اسے بدعت بتلاتے ہیں۔ باوجود ایسے رسالوں کے مستقل خریدار۔ غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے۔ عید مبارک!

ان رسالوں کے مستقل خریداروں غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو کبھی تصاویر شائع نہیں کرتے (کیونکہ اسے شرع شریف کے خلاف سمجھتے ہیں) یا صرف تیسرے چوتھے سال ایک آدھ تصویر شائع کرتے ہیں (کیونکہ اسے اسراف بیجا خیال کرتے ہیں) باوجود ایسے شرعی رسالوں کے اور باوجود ایسے کفایت شعار رسالوں کے مستقل خریدار اور غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے عید مبارک!

ان مؤخر الذکر کفایت شعار رسالوں میں سے ایک رسالے نے جو ہر چوتھے یا پانچویں سال ایک تصویر شائع کرتا ہے۔ مدت ہوئی ایک تصویر شائع کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ رسالے کے ایڈیٹر کی شبیہہ مبارک ہے۔ اسے دیکھ کر ہمیں مولانا جامی کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملا ساغری نے اپنا یہ مطلع مولانا جامی کو جا کر سنایا۔

تا شنیدم کہ تو ان لعل ترا جاں گفتن
آتشے در دلم افتاد کہ نتواں گفتن

مطلع خوب تھا اور پھر ملا ساغری کا مطلع تھا۔ مولانا نے خوب داد دی اور بہت تحسین و آفرین کہی۔ ساغری نے خوش ہو کر کہا کہ آپ حکم دیں تو اس مطلع کو لکھ کر چوک پر لگا دیا جائے مولانا نے فرمایا ہاں ضرور اور بہتر ہے کہ تمہیں بھی ساتھ ہی لٹکا دیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ مطلع کس کا ہے؟

اس رسالے کے مستقل خریداروں۔ غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو عید مبارک!

انہی رسالوں میں سے ایک نے ابھی تھوڑی مدت ہوئی کہ تین ادیبوں کی تصویریں شائع کی تھیں۔ ان ادبائے ثلاثہ میں سے ایک ادیب کا ادبی شاہکار (یعنی عدالتی اشتہار) اسی رسالہ میں شائع ہوا تھا لیکن باقی دو ادیبوں کے ادبی مقالات اس رسالے میں یا کسی اور رسالے میں باوجود تحقیق و تفتیش کے ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ ممکن ہے گمنام لکھتے ہوں۔ اس رسالے کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو آج بوڑھے ہو کر بھی اسی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں جو انھوں نے پیدا ہونے پر زیب تن فرمایا تھا۔ اور تہیہ کر لیا ہے کہ مر کر بھی اسی لباس میں مدفون ہوں گے عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو پیدا ہوئے۔ جوان ہوئے۔ بوڑھے ہوئے اور مر گئے۔ یا جو پیدا ہوئے اور جوان ہوئے اور عین عالم جوانی میں مر گئے۔ یا جو پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ یا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ بوجہ اور باوجود ایسے رسالوں کے مستقل خریدار، غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے عید مبارک!

ان سہ ماہی رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو باوجود سہ ماہی ہونے کے آٹھ روپے سالانہ سے ایک پیسہ کم نہیں لیتے یا جو بوجہ سہ ماہی ہونے کے ایک روپیہ بارہ آنہ سالانہ سے ایک پیسہ زیادہ نہیں لیتے۔ اور جو صرف عالمانہ اور محققانہ مقالات شائع کرتے ہیں (جن عالمانہ اور محققانہ مقالات کو پڑھنے والوں کی تعداد ان عالمانہ اور محققانہ مقالات کے لکھنے والوں کی تعداد سے کبھی زیادہ نہیں ہوئی یا باوجود عالم اور محقق ہونے کے یا بوجہ عالم اور محقق ہونے کے عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو جواہرات کوڑیوں کے مول بیچتے ہیں یعنی بارہ آنہ سالانہ میں پورے بارہ رسالے نذر ناظرین کرتے ہیں۔ ثم یعنی

اپنے جواہرات کو شیخ محمد اصغر جوہری سے بھی ارزاں تر قیمت پر فروخت کرتے ہیں تم یعنی کوڑی کے تین تین مضامین کوئی مضمون ایک کوڑی پر فروخت کرکے اہلِ ملک کی علمی، ادبی، سیاسی، تمدنی معاشری۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور فلسفی خدمت کرتے ہیں بوجہ مجہول، مظلوم اور مغبون ہونے کے عید مبارک!

امابعد ان تمام مذکورہ بالا رسالوں کے ڈائرکٹروں۔ ایڈیٹروں۔ آنریری ایڈیٹروں، اسسٹنٹ ایڈیٹروں، سب ایڈیٹروں اور مدیرانِ مسئول وغیر مسئول و مدیران سائل وغیر سائل و مدیرانِ منقول وغیر منقول و مدیران ناقل وغیر ناقل و مدیران معقول وغیر معقول و مدیران عاقل وغیر عاقل و مدیران مجہول وغیر مجہول و مدیران جاہل وغیر جاہل کو جو عموماً جج، سب جج، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر حکیم، ڈاکٹر، کتاب فروش اور پان فروش (وغیرہ وغیرہ) ہوتے ہیں اور جو رفاہِ عام کی خاطر جج، سب جج، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، حکیم، ڈاکٹر، کتاب فروش اور پان فروش (وغیرہ وغیرہ) ہوتے ہوئے بھی ادبی رسالوں کی ایڈیٹری کے لئے وقت نکال لیتے ہیں اور سالہا سال تک پانچ سو روپیہ ماہوار کے خسارہ پر ان رسالوں کو جاری رکھتے ہیں اور محض اس لئے کہ امت مرحوم کے افراد میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ گھر کا اثاثہ بیچ بیچا کر رسالے چھپواتے رہتے ہیں۔ عید مبارک!

پھر اس کے بعد ان مضمون نگاروں کو اور ان مضمون نگارنیوں کو جو رسالوں میں عریاں عشقیہ کہانیاں لکھ کر رسالوں کے ادبی معیار کو اور ناظرین و ناظرات کے اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر بنانے کی کوشش میں دن رات سرگرداں رہتے ہیں اور ان ادیبوں کو جو مغربیات کو مشرقیات میں یعنی انگریزیات کو ہندوستانیات میں ملاکر ہمارے ہندوستان کے لئے معجون مرکب تیار کرتے رہتے ہیں اور ان بزرگوں کو جو قلزمِ علم میں محققانہ غوطے لگاکر دور کی کوڑی لاتے ہیں اور دیوان حافظ کو دیوان ابن یمین کا جزو مسروقہ ثابت کرتے ہیں اور رباعیات عمر خیام کی تعداد کو کبھی بڑھاتے بڑھاتے پندرہ سو سے اوپر لے جاتے ہیں اور کبھی گھٹاتے گھٹاتے دس پندرہ سے بھی نیچے لے آتے ہیں اور دیوانِ مخفی کے مصنف کو کبھی مذکر بتاتے ہیں اور کبھی مونث

(خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ابھی تک محنت نہیں کہا) اور فردوسی کی حین حیات میں شاہنامہ فردوسی کے چودہ یا پندرہ ایڈیشنوں کا چھپ کر شائع ہو جانا بیان کرتے ہیں۔ اور اردو زبان کو کبھی سنسکرت کی ماں اور کبھی ہندی کی بیٹی اور کبھی پنجابی کی بہو ثابت کرتے ہیں۔ اور جہاں اس بچاری کو کل شاہجہاں کے لشکر کی لین چھوکری بتاتے تھے آج راجہ بکرماجیت کے حرم سرا کی لونڈی کہہ رہے ہیں اور ان استادوں کو جو فن تنقید کو صحیح معنوں میں حاصل کر کے تنقید شعری کو اوج کمال پر لے جا رہے ہیں اور غالب کے بعض شعروں کو بے معنی اور ذوق کے بعض شعروں کو بامعنی بتلاتے ہیں اور ناسخ و آتش کا مقابلہ کر کے ایک دوسرے کو ناسخ و منسوخ بناتے ہیں۔ اور مومن کی غزل کو غالب کی غزل سے بہتر اور غالب کی اردو کو قرآن کی عربی سے بہتر کہہ رہے ہیں عید مبارک!

ابھی تھوڑا عرصہ ہی گذرا ہے کہ ادیبان اردو کے ایک گروہ نے ادبیات میں سے ادب لطیف کو پسند کیا اور ادب لطیف کا شاعرانہ نثر میں ایک نئی بحر کی طرح ڈالی یعنی آ آ آ (رفع۔ رفع رفع) یہ بحر ایسی ہر دلعزیز ہوئی کہ چاروں طرف سے آ آ آ کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ ان ستانہ نعروں میں سے چند جو ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں جی چاہتا ہے کہ ناظرین تک پہونچا دیئے جائیں۔

آ آ آ اے اپنے مرمریں تبسم سے عاشق کے بلوریں دل کو چور چور کر دینے والی۔ آ؛

آ آ۔ اے اپنے ہلال ابرو سے عاشق کے افق تخیل پر ہلال عید نمودار کر دینے والی۔ آ

آ آ۔ اے اپنی گرمی رفتار سے عاشقوں کے کرۂ دل کے بحر منجمد شمالی و بحر منجمد جنوبی کو بھاپ بنا کر اڑا دینے والی۔ آ؛

آ آ۔ اے اپنے ہونٹوں کے لعل مذاب کی سیال سرخی سے میرے آسمان دل کی شفق کی رنگینیوں کو تاریکی میں تبدیل کر دینے والی۔ آ؛

آ آ۔ اے اپنی لبریز خمار آنکھوں کی گردش سے بزم محبت کے بادہ خواروں کو مدہوش

بیوقوف احمق اور مخبوط الحواس بنا دینے والی۔ آ

آ آ۔ اے اپنے ترکش مژگاں کے ایک ایک تیر سے سو سو دلوں میں ہزار ہزار چھید کر دینے والی۔ آ

آ آ۔ اے اپنا حِنائی انگوٹھا دکھا کر اپنے آوارہ مزاج جاں نثاروں کے خرمن اُمید کو آگ لگا دینے والی۔ آ

آ آ۔ اے حُسن کی دیوی جس نے باوجود اپنی تانیث کے عشق کے دیو کو باوجود اس کی تذکیر کے مغلوب و مقہور کر لیا ہے۔ اپنی اس فتح پر اور فریق ثانی کی اس شکست پر نازاں نہ ہو۔ کیونکہ شکست و فتح نصیبوں پر ہے دیکھ کہ مقابلہ تو خوب ہوا ہے۔ اس حقیقت پر نظر کرا ور آ۔

آ آ۔ اے نشۂ شباب کی متوالی۔ یہ نشہ اُتر جانے والا ہے۔ اور بڑھاپا آ جانیوالا ہے دیکھ کہ میں بھی آج سے چالیس سال پہلے جوان تھا اب بوڑھا ہوں انا للہ و انا الیہ راجعون پر غور فرما اور آ۔

آ آ۔ اے حسین قتالہ قتل عمد جرم ہے اور اس جرم کی سزا پھانسی ہے۔ مکافات عمل سے غافل نہ ہو اور ضرور آ۔

آ آ۔ اے حسین و جمیل ساحرہ۔ تو جانتی نہیں کہ سحر گناہ کبیرہ ہے اور اسی گناہ کی پاداش میں سماۃ زہرا اور اس کے دونوں بھائی مسمی ہاروت و مسمی ماروت چاہ بابل میں قید کر دیے گئے تھے ان تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کر اور آ۔

آ آ۔ اے دختر ترسا۔ دیکھ کہ میں تیرا پڑوسی ہوں اور انجیل کا حکم ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبت کر (اور اپنے خاوند سے نفرت) اس مقدس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر اور آ؛

آ آ۔ اے مسیحائی کا دم بھرنے والی اور ساتھ ہی طبقات عشاق میں درد سر۔ درد دل۔ درد معدہ۔ بخار محرقہ۔ درجع مفاصل۔ تپ محرقہ۔ تپ لرزہ۔ ہیضہ اور طاعون پھیلانے والی۔ خدا سے ڈر اور آ؛

آ آ۔ اے رقیب رو سیاہ کے قید خانہ کی چار دیواری میں دن رات بند رہنے والی دفعہ ۴۹۰ تعزیرات ہند کی مطلق پروانہ کرا درآ۔ وعلیٰ ہذا القیاس ؛

یہ بچاری آنے والیاں جب کبھی بھول کر گھر سے باہر قدم رکھتیں تو چاروں طرف سے یہی آآ۔ آ کے نعرے سنتیں اور دل ہی دل میں "جا جا۔ بیہودہ بکواس نہ کر جا" کہتے ہوئے پھر گھروں میں جا چھپتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان آنے والیوں نے گھروں سے باہر نکلنا مطلقاً بند کر دیا اور یہ آآ کہنے والے درد فراق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ جاں بر نہ ہو سکے۔ بعض بچارے برّد اللہ مضجعہٗ ہو گئے۔ (خداوند کریم ان کی خوابگاہوں کو گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم کرے) اور بعض نور اللہ مرقدہٗ بن گئے۔ (اللہ تعالیٰ ان کی آرام گاہوں کو شہر میں ہوں تو بجلی کی روشنی سے اور گاؤں میں ہوں تو مٹی کے تیل کے دیوں سے روشن کرے)

ان مرحوم و مغفور ادیبوں کے نام لیوا اب بھی اگر باقی ہوں تو انھیں عید مبارک!

نیرنگ خیال کے عید نمبر کے کاتب کو بشرطیکہ وہ ہمارے اس علمی، ادبی، اصلاحی۔ اخلاقی۔ مذہبی، تنقیدی، صوفیانہ، فلسفیانہ اور محققانہ مقالے کو ہمارے گذشتہ علمی اور ادبی مقالے (یعنی دال کی فریاد) کی طرح کتابت کی غلطیوں سے کہیں کہیں بے مزہ اور کہیں کہیں بے معنی بنا کر نہ رکھدے عید مبارک!

غلام خامۂ آں کاتبم کہ شعر مرا — چنانچہ بود نوشت و نہ ہرچہ خواست نوشت
اگرچہ شعر فروغ از دروغ مے گیرد — دروغ در است و روہرچہ بود راست نوشت

عید ہر سال آتی ہے اور بعض محققان لغت عرب و فرس کی زبانی سنا گیا ہے کہ اسے عید اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ ہر سال آتی ہے۔ محققین کی اس رائے کی خامی ظاہر ہے کیونکہ روزے بھی (عید سے ایک مہینہ پہلے) ہر سال تشریف لاتے ہیں اور باوجود ہر سال تشریف فرما ہونے کے عید نہیں کہلاتے۔ ہماری ذاتی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ عید کو عید صرف اسی لئے کہتے

ہیں کہ یہ عید ہے اگر عید عید نہ ہوتی تو اسے عید کون کہتا۔ اور اگر کوئی کہتا تو بے وقوف کہلاتا اسی طرح روزے بھی روزے اس لئے کہلاتے ہیں کہ وہ روزے ہیں۔ اگر روزے روزے نہ ہوتے تو انھیں کون عقلمند روزے کہتا۔

مخفی نہ رہے کہ ہر سال دو عیدیں آتی ہیں ایک چھوٹی عید یعنی عید الفطر اور ایک بڑی عید یعنی عید الاضحیٰ (جسے رسالوں اور اخباروں کے مدیران مسئول و مدیران غیر مسئول عموماً عید الضحیٰ لکھتے ہیں) چھوٹی عید سے پہلے روزے رکھنے پڑتے ہیں اور تراویحیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ بڑی عید سے پہلے نہ روزے رکھنے پڑتے ہیں نہ تراویحیں پڑھنی پڑتی ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عید کو چھوٹی عید اور بڑی عید کو بڑی عید کہتے ہیں۔

دولت آں است کہ بے خون دل آید بکنار
ورنہ باسعی و عمل باغ جناں ایں ہمہ نیست

بے شک ایں ہمہ بہت تیس دن روزے رکھ کر ایک دن عید کر لینا بھی اگر عید ہی ہے تو اس عید کو زیادہ سے زیادہ چھوٹی عید ہی کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں۔

نیرنگ خیال والے ہمیشہ چھوٹی عید کے موقعہ پر عید نمبر نکالتے ہیں۔ معلوم نہیں دن کو روزے رکھ کر اور رات کو تراویحیں پڑھ کر یہ لوگ کون سا معجون کھاتے ہیں کہ دن رات ایک کر کے نیرنگ خیال کے عید نمبر جیسا ایک ضخیم اور بے حد دلچسپ عید نمبر مرتب کر کے تیار کر لیتے ہیں۔ غالباً جہاں تک روزے اور تراویح کا تعلق ہے ان بزرگوں کی چھوٹی عید کسی طرح بھی بڑی عید سے چھوٹی نہیں ہوتی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اندریں حالات ظن غالب یہی ہے کہ نیرنگ خیال والوں کی عید (یعنی چھوٹی عید) عید کے مندرجہ ذیل اقسام میں سے تیسری قسم کی عید ہے۔ اگر ہمارا یہ ظن ظن المومنین نہ ہو تو یہ صاحبان ہمیں اطلاع دے سکتے ہیں ہم نہایت صدق دل سے تردید شائع کرنے پر تیار ہوں گے۔ اگر

اس پر بھی ان کی تسلی نہ ہو تو وہ ہم پر ازالہ حیثیت عرفی (یا اگر چاہیں تو ازالہ حیثیت فیضی) کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ خیر چہ عدالت و خرچہ وکیل وغیرہ کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے ؛

ناظرین کرام پر واضح ہو کہ جہاں ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی صرف ایک قسم ہوتی تھی۔ وہاں اسلامی تیوہار بھی صرف ایک ہی قسم کے ہوتے تھے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا اور علم و تہذیب کی برقی روشنی نے انسانی آنکھوں کو خیرہ و تیرہ کرنا شروع کر دیا مسلمانوں کی کئی قسمیں ہو گئیں اور ساتھ ہی اسلامی تیوہاروں کی بھی کئی قسمیں بن گئیں۔ چنانچہ چھوٹی عید بچاری بھی اس تقسیم سے نہ بچ سکی اور چار قسموں میں منقسم ہو گئی۔

(۱) ان لوگوں کی عید جو روزے رکھتے ہیں اور عید کرتے ہیں۔ ؛

(۲) ان لوگوں کی عید جو روزے رکھتے ہیں اور عید نہیں کرتے ؛

(۳) ان لوگوں کی عید جو روزے نہیں رکھتے اور عید کرتے ہیں ؛

(۴) ان لوگوں کی عید جو نہ روزے رکھتے ہیں اور نہ عید کرتے ہیں ؛

اس تقسیم پر اگر کوئی منطقی منطقیانہ اعتراض یا کوئی مولوی مولویانہ اعتراض کرے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ کیونکہ ہم بعونہ تعالیٰ نہ منطقی ہیں۔ نہ مولوی۔ صرف مضمون نگار ہیں اور رسالوں کے مضمون نگاروں کو نہ منطقی ہونے کی ضرورت ہے۔ نہ مولوی ہونے کی حاجت۔ صرف رسالوں کا مضمون نگار ہونا کافی ہے۔

اما بعد پہلی قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو سیدھے سادے مسلمان ہوتے ہیں نہ روزے کی فلاسفی پر بحث کرتے ہیں اور نہ اس کے طبی اغراض و مقاصد سے کچھ واسطہ رکھتے ہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ روزے آئے۔ بڑے اہتمام سے سویرے اٹھتے ہیں سحری نوش جاں فرماتے ہیں۔ دن بھر نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں (پینے میں حقہ پانی دونوں شامل ہیں) شام کو افطاری کا انتظام کرتے ہیں اور بڑے سلیقہ سے روزہ کھولتے ہیں۔

مہینہ بھر اسی پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ مہینہ گزرنے پر (یا ایک دو دن پہلے ہی) بڑے شوق سے ہلال عید کے لئے افق مغرب پر آنکھیں سی دیتے ہیں اور چاند دیکھ کر یا سُنکر کہ کسی نے چاند دیکھ لیا ہے عید کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز صبح سویرے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر (یا بعض صورتوں میں نہا کر) نئے یا دُھلے ہوئے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ اور عیدگاہ میں جانے کے لئے پا بہ رکاب ہو بیٹھتے ہیں۔ جب عیدگاہ میں پہنچکر صفیں سیدھی کر لیتے ہیں (یعنی اتنی سیدھی جتنی ان سے توقع ہو سکتی ہے) تو زائد تکبیروں کے لئے عین نماز میں ادھر ادھر دیکھتے جاتے ہیں کہ غلطی نہ ہو جائے۔ نماز ختم کر کے باقی تمام نمازیوں سے بغلگیر ہوتے ہیں اور سال بھر کا کہا سُنا بخشواتے ہیں۔ پھر گھر آتے ہیں اور دہلی کے ہوئے تو سوتیاں اور لاہور کے ہوئے تو سیویاں کھاتے ہیں۔ اس قسم کے تمام سیدھے سادے مسلمانوں کو عید مبارک!

دوسری قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو پکّے مسلمان ہوتے ہیں۔ روزے اس لئے رکھتے ہیں کہ روزے رکھنا فرض سمجھتے ہیں اور عید اس لئے نہیں کرتے کہ عید کا سامان کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نئے کپڑے تو خیر پرانے کپڑوں کی دُھلائی بھی نہیں دے سکتے۔ عیدگاہ میں جاتے ہیں لیکن کوئی اُن سے بغلگیر نہیں ہوتا۔ بچارے ڈرتے ڈرتے دُور ہی سے لوگوں کو عید مبارک کہہ لیتے ہیں اور جو لوگ ان کی عید مبارک کے جواب میں عید مبارک کہہ دیتے ہیں وہ گویا اپنی نوع انسان کے لئے بڑی قربانی کرتے ہیں اور اس قربانی پر دل ہی دل میں نازاں رہتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تو ہو جاتے ہیں خدا نہ کرے کہ کوئی وقت ایسا آئے کہ یہ بات بھی داستانِ پارینہ ہو کر رہ جائے ان بے برگ و نوا مسلمانوں کو بہت بہت عید مبارک!

تیسری قسم کی عید اُن مسلمانوں کی عید ہے جو سب سے زیادہ اسلام کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ گو بوجہ ضعف معدہ یا بوجوہ دیگر روزے نہیں رکھ سکتے۔ لیکن عید سب سے

زیادہ شان و شوکت کے ساتھ مناتے ہیں۔ عیدگاہ میں سب سے پہلے تشریف لے جاتے ہیں اور سب سے پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور غریب مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ نماز میں شامل ہو کر دنیا کو جہاد بالنفس کی تعلیم دیتے ہیں۔ عیدگاہ سے نکل کر سیدھے گھر آتے ہیں اور آرام کرسی پر تشریف رکھ کر سامنے دو چار قسم کے خشک میوے اور کچھ شیرینی وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ تمام شہر کے لئے خوان یغما ہوتا ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں عید مبارک کہتے ہیں اور دو چار دانے کسی چیز کے کھا کر واپسی کی اجازت طلب کرتے ہیں یہ تانا بانا دو تین گھنٹے لگا رہتا ہے۔ آپ کرسی پر بیٹھے دل ہی دل میں بڑی احتیاط سے اُن لوگوں کی فہرست مرتب کرتے جاتے ہیں جو ان کے پاس سلام کرنے کو آتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ جو بچارے کسی معقول یا غیر معقول وجہ سے عید کے سلام کے لئے حاضر نہیں ہو سکتے وہ بلیک لسٹ میں درج کر لئے جاتے ہیں۔ یہ سیاہ فہرست بھی دل ہی میں مرتب ہوتی ہے۔ اور سال بسال بڑھتے بڑھتے ان صاحب کے دل کو بالکل سیاہ کر دیتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ اسلام کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں ملت بیضا کے رہنما بھی ہوتے ہیں اس لئے اُن کو بھی عید مبارک!

چوتھی قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو جدید تہذیب یافتہ مسلمان ہیں نئی تہذیب کی روشنی نے اُن لوگوں کے دلوں کو اس درجہ منور کر دیا ہے کہ وہ ہر ایک چیز کے حقایق و معارف پر نگاہ غائر ڈالنے کے اہل ہو گئے ہیں۔ وہ روزے کی فلاسفی پر غور کرتے ہیں تو کم از کم موجودہ زمانے میں روزے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے وہ روزے نہیں رکھتے۔ وہ روزے کے طبی اغراض پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے رسمی صورت میں ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کبھی نصیب اعدا بیمار پڑ جاتے ہیں تو ڈاکٹر کے مشورہ پر ایک آدھ وقت کھانے کا ناغہ کر لیتے ہیں۔ عید یہ لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اس میں انہیں اسراف نظر آتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ آجکل مسلمانوں کے لئے کفایت شعاری ایک ایسی

غیر ضروری چیز ہے جس پر تمام تیوہاروں کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ عیدگاہ میں وہ اس لئے نہیں جاتے کہ وہ ہمیشہ (یعنی دن رات) انگریزی لباس میں ملبوس رہتے ہیں اور اس لباس میں رکوع سجود اور قعود کا رے دار د۔ ان تہذیب یافتہ مسلمانوں کو اگر کوئی آدمی (غلطی سے) عید مبارک کہدے تو وہ اسے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم چونکہ بیوقوف نہیں اور اگر (ناظرین نیرنگ خیال کی رائے میں) ہم بے وقوف ہیں بھی تو بے وقوف کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے ہم اُن بیحد تہذیب مسلمانوں کو عید مبارک کہنے سے پرہیز کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اگر نیرنگ خیال کے پڑھنے والوں میں بھی کوئی صاحب بے حد تہذیب مسلمان ہوں تو وہ ہمیں اس امر میں معذور سمجھیں۔

یہ تقسیم اصولی تھی اگر فروعات کا خیال کیا جائے تو اور کئی قسمیں بھی عید کی اور عید کرنے والوں کی موجود ہیں مثلاً وہ لوگ جو سحری کھاتے ہیں اور روزے نہیں رکھتے۔ اس صنف کے ابوالآبا پرانے زمانے کے ایک بزرگ تھے۔ رمضان آیا اور آپ نے بیگم صاحبہ کو تاکید کی کہ سحری کے لئے یہ چیز بھی تیار ہونی چاہیئے اور وہ چیز بھی۔ یہ کھانا بھی ہو اور وہ بھی۔ اسی طرح کئی عمدہ عمدہ کھانے تیار کرانے کا انتظام فرمالیا۔ اور سحر کے وقت ان کھانوں پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ دو چار دن یہی پروگرام چلتا رہا۔ ایک روز بیوی کو معلوم ہوا کہ میاں سحری تو کھاتے ہیں لیکن روزے نہیں رکھتے سحری کے اس نیچا ترود پر ناراض ہوئی اور میاں سے شکایت کی کہ جب آپ روزے نہیں رکھتے تو آدھی رات کو مجھے سحری تیار کرنے کی تکلیف کیوں دیتے ہیں میاں نہایت غصہ سے بولے بیوقوف! تم نے مجھے اتنا ہی کافر سمجھ لیا ہے کہ روزے بھی نہ رکھوں سبحان اللہ کیا معقول جواب ہے حقیقت بھی یہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کو روزے رکھنے کی تاکید ہے وہاں سحری کھانے کا بھی حکم ہے۔ اگر دونوں حکموں کی تعمیل ممکن نہ ہو تو ایک حکم کی تعمیل ہی سہی۔ اسی صنف کے ایک اور مسلمان کی روایت کرتے ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک دوست نے گلہ کیا کہ تم مسلمان ہو کر نماز نہیں پڑھتے

اُس نے جواب دیا کہ قرآن کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ دوست نے حیران ہوکر پوچھا کہ قرآن میں نماز نہ پڑھنے کا حکم کہاں ہے۔ اس نے کہا قرآن شریف میں آیا ہے لاتقربوا الصلوٰۃ (یعنی نماز یا مسجد کے نزدیک مت جاؤ) دوست نے کہا کہ اگلی عبارت بھی پڑھئے (وانتم سکاریٰ = بجالیکہ تم نشے میں ہو) اس پر وہ شخص جھنجھلا کر بولا کہ سارے قرآن پر تمہارے باپ نے عمل کیا ہوگا۔ ہم سے تو جتنا بن پڑتا ہے کرتے ہیں ؂

اس قسم کے تمام مسلمانوں کو چونکہ وہ سحری بھی کھاتے ہیں اور عید بھی کرتے ہیں (گو روزے نہیں رکھتے) اور نیز چونکہ ان کے پاس ایسا کرنے کے معقول دلائل بھی موجود ہیں۔ عید مبارک!

اس فروعی تقسیم میں ان لوگوں کا ذکر بھی غالباً بیجا نہ ہوگا جو روزہ رکھ کر دائرہ انسانیت سے خارج ہوجانا اپنا شرعی حق سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ روزہ رکھ کر دن بھر لڑنے مرنے پر تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ذرا سی بات بھی ان کے خلاف طبع ہوگئی تو وہ فوراً غصے میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہوش سنبھال کر بات کرو۔ میں نے روزہ رکھا ہے (گویا تمام اولاد آدم پر احسان کیا ہے) اگر دوسری طرف سے جواب ذرا بھی اونچ نیچ ہوئی تو یہ صاحبان ایک دوسرے کے گلو گیر ہوگئے اور تحفظ حقوق شریعت کو یہاں تک پہنچایا کہ کچہری جا پہونچے۔ اس قسم کے واقعات رمضان میں عام طور پر ہوتے رہتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو آخر روزہ رکھا ہے اور اگر روزے سے طبیعت پر اتنا بھی اثر نہ ہو تو وہ روزہ روزہ ہی کیا۔ ان اصحاب کو بھی عید مبارک!

اسی تقسیم میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو رمضان میں سحری اور افطاری کو ملا کر روزانہ اتنا کھا جاتے ہیں جتنا وہ رمضان سے باہر تین دن میں بھی نہیں کھا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معدہ کام کرنے سے جواب دے بیٹھتا ہے۔ انہی لوگوں کی برکت سے رمضان میں اکثر بدہضمی اور ہیضہ کی شکایت ہوجاتی ہے۔ دن بھر ان لوگوں کے منہ سے سوء

ہضم کی وجہ سے بو آتی رہتی ہے اور ان کے پاس بیٹھنا ایک اچھی خاصی مصیبت بن جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں اور فخر کیوں نہ کریں۔ مولوی صاحبان ان کو رمضان کے وعظ میں ہمیشہ بتایا کرتے ہیں کہ روزہ دار کے منھ سے جو بو نکلتی ہے اُسے نکلتے ہی فرشتے منھ میں ڈال کر آسمانوں پر چلے جاتے ہیں ممکن ہے یہ بات درست بھی ہو ورنہ یہ لوگ تمام کرۂ ارضی کی ہوا کو متعفن کر دینے کے اہل ہوتے ہیں بہر حال صرف پُرخوری کے الزام پر ان صاحبان کو عید مبارک سے محروم رکھنا قرین انصاف معلوم نہیں ہوتا لہٰذا ایسے تمام روزہ داروں کی خدمت میں بھی عید مبارک!

اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ روزہ دار جنھیں تمباکو پینے کی عادت ہوتی ہے تمام دن حقہ نہ ملنے کی وجہ سے شام کے وقت بالکل بے صبر ہو جاتے ہیں۔ افطار سے ایک گھنٹہ پہلے حقہ لے کر بیٹھتے ہیں اور اسے تازہ کرتے ہیں اور پھر تازہ کرتے ہیں۔ افطار سے چند منٹ پہلے چلم میں خشک پشاوری تمباکو بھرتے ہیں اور دیا سلائی ہاتھ میں لے کر نقارے کا انتظار کرتے رہتے ہیں جب اُدھر ڈم ڈم ہوئی انھوں نے تمباکو کو دیا سلائی دکھائی اور دو تین وہ زبردست کش حقے کے لئے کہ الامان الامان۔ پچاس فیصدی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کش لگاتے ہی لیٹ جاتے ہیں اور بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ ہوش آنے پر اُن کی مشتاق نگاہیں زبانِ حال سے حقے کو مخاطب کر کے کہتی ہیں۔

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی | سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دور آنچناں کہ گفتم | نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

فلہٰذا تمباکو، نسوار، چرس، چنڈو، مدک، گانجا، افیون، شراب، بھنگ اور اسی قسم کے دوسرے مفرحات سے روزہ کھولنے والے روزہ داروں کو عید مبارک!

اور سچ پوچھیئے تو عید صرف اُن بچّوں کی عید ہے جن پر ابھی روزے فرض نہیں لیکن شوق سے روزے رکھتے ہیں۔ دن بھر کی بھوک پیاس اور پابندی ان کے پھول جیسے

چہروں کو مرجھا دیتی ہے۔ ابھی روزہ کھلنے میں دو تین گھنٹے باقی ہوتے ہیں کہ وہ گھبرا گھبرا کر ہر پانچ منٹ کے بعد گھر کے بڑوں سے پوچھتے ہیں کہ افطاری میں ابھی کتنی دیر ہے ماں باپ انھیں دن میں کئی دفعہ روزہ توڑ دینے کے لئے کہتے ہیں لیکن وہ نہیں مانتے ایک دو نہیں کئی کئی روزے اسی طرح رکھ گزرتے ہیں اور پھر عید بھی اسی شوق سے مناتے ہیں۔ ایسے تمام بچوں کو عید مبارک!

اما بعد تمام مولوی صاحبان کو خواہ وہ "مولوی امام مسجد ہوں" خواہ مولوی غیر امام مسجد (یعنی خواہ وہ نماز اجرتاً پڑھتے ہوں خواہ عادتاً) اور تمام مولوی صاحبان کو خواہ وہ دیوبندی ہوں خواہ فرنگی محلی۔ خواہ مقلد ہوں خواہ غیر مقلد۔ خواہ حنفی ہوں خواہ غیر حنفی خواہ چشتی ہوں خواہ غیر چشتی۔ خواہ سی۔ آئی۔ ڈی خواہ غیر سی۔ آئی ڈی۔ خواہ پکے تنخواہ دار ہوں خواہ صرف وظیفہ خوار خواہ مسجد کے ٹکڑے ہوں خواہ مدرسہ کے (یعنی خواہ نماز عیب پڑھنی پڑھانی آتی ہو خواہ نہ آتی ہو) خواہ ندوی ہوں خواہ غیر ندوی۔ خواہ لکھ پڑھ سکتے ہوں خواہ مطلق ان پڑھ ہوں۔ بوجہ اس کے کہ انہیں روزے کھاتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا اور بوجہ اس کے کہ وہ تمام تر ڈاڑھی دار ہوتے ہیں (خواہ وہ ڈاڑھی مختصر ہو خواہ مطول) عید مبارک!

پھر ان تمام واعظ صاحبان کو جو رمضان شریف میں مسجدوں کو منڈیاں سمجھ کر متاع وعظ بیچنے کے لئے شہر شہر پھرا کرتے ہیں اور ہر وعظ میں بالالتزام یہ بتایا کرتے ہیں کہ اگر کوئی (امیر) آدمی کسی معقول وجہ سے یا کسی غیر معقول وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو وہ فی روزہ کس قدر مال کسی مستحق کو (یعنی خود واعظ صاحب کو) دے۔ نیز ان تمام حافظ صاحبان کو جنہیں تراویحوں میں قرآن سنانے کے لئے کوئی مسجد مل گئی ہو یا جنہیں باوجود تگ و دو کے قرآن سنانے کے لئے کوئی مسجد نہ ملی ہو۔ خواہ قرأت ان کی بصری ہو خواہ مصری (کیونکہ ہدیہ دونوں کا برابر ہے) عید مبارک!

سب سے بعد (لیکن سچ پوچھیے تو سب سے پہلے) خود ہمیں کہ ہم نے سب کو عید مبارک کہی اور کسی نے ہمیں عید مبارک نہ کہی۔ عید مبارک!

گرما و سرما

نیرنگ خیال والوں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بارود خانہ میں رہ کر سامان آتشبازی کے لئے مفصلات میں آرڈر بھیجتے ہیں۔ چنانچہ کل کی ڈاک سے حکیم صاحب کی ایک چٹھی ہمیں موصول ہوئی کہ عید نمبر کے لئے کوئی مضمون از قسم آرڈر بھیجکر مشکور فرمائیں کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ یہ عید الفطر ہے یا لوہڑی کہ آپ اس کے لئے پٹاخوں، چرخیوں، مہتابیوں، آفتابیوں، ہوائیوں، چھچھوندروں اور اناروں کا بندوبست کر رہے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان بارود خانہ والوں نے اتنی دور بیٹھے ہوئے بغیر دیکھے یہ خوب سمجھ لیا ہے کہ یہ ادیب صاحب بھی کوئی پکے آرڈ ہیں۔ بہت خوب پہچانا حضرت! اب ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ "چہ طور شناختی آغا!"

ادھر ہماری مضمون نویسی کی طرز و روش عجیب متضاد اصولوں پر مبنی ہے۔ یعنی ہم اپنے مضمونوں میں کسی ثقیل لفظ کا لانا بے ادبی اور کسی خفیف لفظ کا لانا ادب ناشناسی خیال کرتے ہیں۔ اب ناظرین کرام خود دیکھ سکتے ہیں کہ ایسی مضمون لکھ کر ہم نہ ادیب رہ سکتے ہیں نہ مؤدب۔ لیکن "الامر فوق الادب" پر عمل پیرا ہو کر اب مجبوراً ہم ادب و قواعد کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں یعنی علم ادب کے اصولوں اور قواعد صرف و نحو کے ضابطوں سے بلند تر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:-

ہمارا شہر جسے ہم مصلحتاً (یعنی اپنی رسوائی کے ڈر سے) انگریزی طرز میں پہلے لفظ کا صرف پہلا حرف لے کر اے۔آباد کہتے ہیں سطح سمندر سے ۴۱۲۰ فٹ اونچا ہے۔ گو یہ پیمائش ہم نے خود نہیں کی اور نہ ہماری نگرانی میں ہوئی ہے۔ الّا نہ بانی صاحبان انگریز کی یہی سنا ہے اور جو کچھ زبانی صاحبان انگریز کی سنا جائے اُسے باور نہ کرنا انگریزی خواں مولاناؤں کی شریعت کی رُو سے کفر ہے۔ اور تعزیراتِ ہند کی رُو سے بغاوت۔ پس چونکہ ہم نہ کافر کہلانا چاہتے ہیں اور نہ باغی۔ اس لئے طوعاً و کرہاً ہم اس عدد کو صحیح اور بالکل صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ البتہ اتنی شہادت ہمارا دل بھی دیتا ہے کہ یہ شہر ضرور سطح سمندر سے کچھ اوپر واقع ہے۔ ورنہ اس کا پانی بہہ کر سمندر میں کس طرح جا ملتا (کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف جاتا ہے) اے۔آباد کی ۴۱۲۰ فٹ کی بلندی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جبکہ کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں کی لگاتار اور موسلا دھار بارش کے بعد آپ گھر سے باہر تشریف لیجائیں تو سڑکوں پر اس طرح معلوم ہو کہ گویا ابھی میونسپل کمیٹی والوں نے چھڑکاؤ کیا ہے (لیکن اس میونسپل کمیٹی کو ہمارے شہر کی میونسپل کمیٹی نہ سمجھیں۔ کیونکہ یہ کمیٹی سڑکوں پر پانی چھڑکنے کو کفایت شعاری کے اصولوں کے منافی اور گرد و غبار کو ٹیکس دہندوں کے پھیپھڑوں کے لئے نہایت مفید ٹانک تصور کرتی ہے) اے۔آباد کے مقابلہ میں کسی ایسے شہر کو لیجئے جو سطح سمندر سے ۴۱۲۰ فٹ اونچا نہ ہو دور کیوں جائیے پشاور کو دیکھئے ایک گھنٹہ کی بارش پورے ایک ہفتہ کے لئے اس قدر کیچڑ مہیا کر دیتی ہے جو نہ صرف پشاوریوں بلکہ سچّہ سقّہ والے کابلیوں اور درّہ خیبر کے نواح والے آفریدیوں، ذکاخیلیوں اور مہمندوں کے تمام سیاسی، معاشری، اخلاقی، مذہبی تعلیمی، دیوانی اور فوجداری ضروریات کے لئے کافی اور کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ بارش کے دن یا بارش سے کئی دن بعد کبھی بازار سے نکل جایئے ایسا معلوم ہوگا کہ کیچڑ کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ جس کے دونوں کناروں پر دوکانیں اور مکان آباد ہیں۔ گویا

سری نگر کا شہر ہے کہ دریائے جہلم کے دورویہ تعمیر ہوا ہے۔

برخلاف اس کے اٹے۔ آباد کے پانی کا ہر ایک قطرہ اپنی برادری کے دوسرے افراد سے مل کر نالہ دوڑ سے ہوتا ہوا آیا انڈس (یعنی دریائے سندھ کے راستے) دشت و صحرا کو چیرتا ہوا بحر ہند میں جا ملتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس شہر کا پانی ہمیشہ "تھرو پراپر چینل" چلتا ہے۔ یعنی پہلے گلیوں کی نالیوں میں۔ پھر نالہ جب میں۔ پھر نالہ دوڑ میں۔ پھر دریائے سندھ میں پہونچکر سیدھا اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ اگر میدانی علاقوں کے پانی کی طرح یہ پانی بھی اِدھر اُدھر آوارہ ہو جائے تو کبھی منزلِ مقصود پر نہ پہونچے۔ کیونکہ قانونِ قدرت کی رُو سے منزلِ مقصود پر پہنچنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ذریعہ ہے۔ یہی پراپر چینل۔ جو کام آپ تھرو پراپر چینل کریں گے وہ کبھی خراب نہ ہوگا اس راہ پر چلئے تو کوئی سدِّ راہ آپ کے مزاحم نہ ہو سکے گا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ گزشتہ گرمیوں میں یہی ہمارے علاقے کا پانی اپنی پراپر چینل کے ذریعے بحر ہند کی طرف تشریف لے جا رہا تھا کہ دوڑ کا پل راہ میں مزاحم ہوا۔ پھر کیا تھا۔ نہ دوڑ کا پل تھا اور نہ وہ اس کی مزاحمت۔ چنانچہ آج تک وہ پل دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کے پایوں کی بُنیادیں بھی ابھی قائم نہیں ہوئیں۔ بحالیکہ سرکار دولتمدار (میم نافیہ) کا ہزارہا روپیہ آج تک روڑی کنکریٹ اور سمینٹ کی شکل میں شتر مرغانِ محکمہ بارکماسٹری کے پیٹ میں جا کر ہضم ہو چکا ہے۔

ہمارے بار روم کے ملحقہ ایک باتھ روم ہے جس میں ایک برتن پڑا ہوا ہے جسے انگریزی میں پس پاٹ کہتے ہیں۔ استادِ زمانہ نے اس پس پاٹ میں کئی سوراخ کر دیئے ہیں اور پانی اُن سوراخوں سے نکل کر باتھ روم کے فرش سے ہوتا ہوا۔ نالی میں چلا جاتا ہے۔ ایک دن ایک صاحب کہنے لگے کہ اس پس پاٹ کے وہاں رکھنے کا

کیا فائدہ ہے۔ پانی یوں بھی فرش پر ہی جا رہا ہے۔ چودھری صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ نہیں رہنے دیجئے ہر کام بطرو پراپر چینل ہونا چاہیئے۔ اس پر تمام اصحاب نے چودھری صاحب کی اس ضابطہ پسند طبیعت کی بہت داد دی۔ چنانچہ یہ پیں پاٹ اب تک وہیں پڑا پراپر چینل کا کام دے رہا ہے ؛

آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ہماری سرکار ہندوستانیوں کی چیخ پکار کے باوجود مہاتما گاندھی کے چرخہ کاتنے کے باوجود مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی کے باوجود کانگریس کے ریزولیوشن کے باوجود۔ تلک فنڈ کے چندوں کے باوجود۔ مولانا ظفر کے نکاہات کے باوجود۔ انقلاب کے افکار و حوادث کے باوجود۔ مسلم لیگ اور مسلم اوٹ لک کے باوجود۔ ہماری حریت آموز اور حیات افروز نظموں کے باوجود اور سب سے بڑھ کر ساونڈرس مرڈر کیس اور دہلی بمب آؤٹریج کے باوجود ہندوستان پر کس طرح بالاستقلال حکومت کر رہی ہے؟ بات یہ ہے کہ سرکار جو کام کرتی ہے بطرو پراپر چینل کسی کو انڈمان بھیجتی ہے تو بطرو پراپر چینل کسی کو انڈیا کونسل کا ممبر بنا کر انگلستان بھیجتی ہے۔ تو بطرو پراپر چینل غرضیکہ سرکار کے کسی کام میں آپ بے راہروی (یعنی آوارہ گردی) نہ دیکھیں گے۔ آپ نے کبھی کسی سرکاری محکمہ میں کوئی درخواست دی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس پر پہلا حکم یہ ہوتا ہے کہ "سررشتہ سے کیفیت گزرے" آپ کسی پر نالش کریں تو پہلا فقرہ جو آپ کے عرضی دعوے پر لکھا جائے گا یہی ہوگا کہ سررشتہ سے کیفیت گزرے یہ سررشتہ کی کیفیت ہماری سرکار کی پراپر چینل کا سب سے پہلا مرحلہ ہے ؛

آپ روز روشن میں عین احاطہ کچہری میں تمام حکام وقت کی آنکھوں کے سامنے کسی کو قتل کر کے دیکھ لیں۔ موقعہ پر آپ کو کوئی پھانسی نہیں دے گا۔ پہلے ابتدائی رپورٹ مرتب ہوگی۔ پھر پولیس پرچہ چاک کریگی۔ پھر تفتیش کرے گی۔ پھر چالان مرتب کریگی

پھر وہ چالان پاس ہوگا۔ پھر عدالت میں پیش ہوگا۔ گواہان استغاثہ بلائے جائیں گے وہ آپ کے روبرو بیان دیں گے۔ آپ ان پر جرح کریں گے۔ گویا وہ تمام جھوٹ بک رہے ہیں۔ کمرۂ عدالت میں وقتاً فوقتاً آپ کو "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگانے کی بھی اجازت ہوگی۔ پھر آپ کا بیان ہوگا۔ بیان کے بعد آپ پر فرد جرم مرتب ہوگا۔ اور پھر آپ کا مقدمہ سپرد عدالت سشن ہوگا۔ وہاں پھر وہی گواہ اور پھر وہی بیانات از سر نو لکھے جائیں گے از سرِ نو جرح ہوگی۔ آپ کی صفائی کے گواہ لئے جائیں گے جو بروز وقوعہ آپ کو موقعۂ واردات سے پانچسو کوس دُور بیان کریں گے۔ وکلاء کی بحث ہوگی۔ اسیسروں سے رائے پوچھی جائے گی۔ سشن جج فیصلہ لکھے گا۔ اور آپ کے لئے پھانسی تجویز کریگا یہ تجویز ہائی کورٹ میں جائے گی۔ آپ کی اپیل بھی وہاں سُنی جائے گی۔ جو مسترد ہوگی بعد ازاں حضور لاٹ صاحب آپ کی رحم کی درخواست پر غور فرمائیں گے اور اُسے نامنظور کریں گے۔ اس کے بعد آپ کے پھانسی پر لٹکائے جانے کی تاریخ مقرر ہوگی۔ اس تاریخ پر لاہور سے پانچ روپیہ یومیہ پر ایک جلّاد منگوایا جائے گا جو آپ کو جناب معلّی القاب سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر جیل اور ایک اور حاکم وقت کے روبرو صحیح سالم اور بخیر و عافیت گلے میں رسّی ڈال کر ایک کنوئیں میں لٹکا دیگا۔ پھر آپ جتنی دیر چاہیں زندہ لٹکتے رہیں اور زندہ لٹکتے لٹکتے تھک جائیں تو بیشک مرجائیں کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

یہہ راز ہے ہماری سرکار کی حکومت کا۔ اگر آج گورنمنٹ عالیہ مقررہ پرا پر جیل کا کام کرنا چھوڑ دے تو کل اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مہاتما گاندھی بے شک چرخہ نہ کاتیں اور ہم بے شک نظمیں لکھنا چھوڑ دیں۔

اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ اللہ میاں روزِ اوّل سے لے کر آج تک خدائی اور شہنشاہی کر رہا ہے اور کبھی کوئی مُچہ سقہ اسے تخت و تاج سے محروم کرنیکے لئے نہیں آیا

اس کی کیا وجہ ہے۔ وجہ بس یہی ہے کہ اللہ میاں کے تمام کام بھی تھرو پراپرچینل ہوتے ہیں۔ وہ قادرِ مطلق ہے سب کچھ کر سکتا ہے اور کسی قاعدے یا ضابطے کا وہ قانوناً پابند نہیں۔ لیکن پراپرچینل والے قاعدے کی خلاف ورزی وہ بھی کبھی نہیں کرتا۔ کبھی آپ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جسے اللہ میاں نے تھرو پراپرچینل پیدا نہ کیا ہو۔ کبھی آپ نے کوئی ایسا جانور سُنا ہے جو تھرو پراپرچینل نہ آیا ہو۔ کبھی خدا نے کوئی درخت ہوا میں اُگایا ہے کبھی اُس نے کسی موتی کو گھڑے کے پانی میں نشوونما دی ہے۔ کبھی اُس نے بغیر بادل کے مینھ برسایا ہے؟

پس یقین جانئے کہ دنیا میں تمام کامیابیوں کا راز اسی تھرو پراپرچینل والے قاعدہ میں پوشیدہ ہے ؎

بات سے بات نکل آئی اور ہم کہیں سے کہیں جا پڑے۔ مدعا صرف یہ تھا کہ آبِ کے پانی کا ہر ایک قطرہ تھرو پراپرچینل بحرِ ہند میں جا پہنچتا ہے اور اس لئے اس شہر میں کیچڑ کا نام نہیں ہوتا سطح سمندر سے ۱۲۰ فٹ بلند ہونے کا ایک تو یہ فائدہ تھا اور دوسرا یہ ہے کہ یہاں گرمی بہت کم ہوتی ہے۔ اور سردی بہت زیادہ۔ گو ہم نے سائنس اسکول میں بھی پڑھی تھی اور ایک مولوی صاحب امام مسجد سے بھی۔ لیکن اب تک ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ جو شہر سطح سمندر سے اتنا اونچا ہو یعنی میدانی ملکوں کے مقابلہ میں سورج سے اس قدر قریب ہو وہاں گرمی کیوں کم ہو اور سردی کیوں زیادہ۔ بہرحال ع رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ ہم کو اس سے کیا پڑی ہے ہم تو یہ دیکھ کر خوش ہیں کہ یہاں گرمی زیادہ نہیں ہوتی ؎

اور شہروں میں بھی گرمی آتی ہے اور گرمی کے بعد سردی آتی ہے اور سردی کے بعد گرمی۔ گرمی اپنے ساتھ گرمی کے سامان لاتی ہے اور سردی اپنے ساتھ سردی کے سامان

لیکن ہمارے شہر کے گرمی کے سامان اور شہروں کی گرمی کے سامان اور ہمارے شہر کی سردی کے سامان اور شہروں کی سردی کے سامان سے بالکل مختلف ہوتے ہیں - اور شہروں کی گرمی اپنے ساتھ جسم کو جھلسا دینے والی گرم ہوائیں لاتی ہے اور آندھیاں پسینہ لاتی ہے - اور سن سٹروک خس کی ٹٹیاں لاتی ہے - اور بجلی کے پنکھے - رنگا رنگ کے شربت لاتی ہے اور کارخانے کی برف - ہمارے شہر کی گرمی ان چیزوں میں سے ایک چیز بھی اپنے ساتھ نہیں لاتی ÷

ہماری گرمی جو سامان اپنے ساتھ لاتی ہے اس کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو - جوں ہی موسم بہار (جسے شاعر لوگ فصل گل بھی کہتے ہیں) رفتن مصدر کی گردان میں ماضی مطلق پر پہنچا اور گرمی نے دراز ورکیا تو ایک روز علی الصباح جب کہ آپ بستر استراحت پر ابھی آرام فرماتے ہوں گے - باہر سڑک سے ایک نہایت مترنم آواز آئے گی "لوالو جونکاں" ÷

بس اس روز سے سمجھئے کہ گرمی آ گئی ہے اور پنجاب میں لُو چل رہی ہے - ان جونکوں والے خانہ بدوشوں کو خدا جانے کس نے کہہ دیا ہے کہ آتے - آباد کے رہنے والوں کا خون گرمیوں کے شروع میں ہی فاسد ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ جوق در جوق یہاں پہونچ جاتے ہیں اور گلی گلی کوچے کوچے پکارتے پھرتے ہیں - "لوالو جونکاں" ÷

دوسرے روز شام کے وقت آپ سیر کو نکلیں گے تو دیکھیں گے کہ چوک میں ایک مداری بیٹھا ڈگڈگی بجا رہا ہے - اور شہر کے تمام بیکار سے اس کے گرد جمع ہیں - یہ مداری ہمارے پولیٹیکل مداریوں (یعنی بعض ہندوستانی لیڈروں) کی طرح کچھ شعبدے دکھلائے گا - اور کچھ فضول باتیں بنا کر لوگوں کی جیبیں خالی کرائیگا - اور تماشہ ختم ہونے پر اپنی جیب پُر کرکے دل ہی دل میں ہنستا ہوا کسی سرائے کو چلا جائیگا کہ آج خوب الو بنائے - کل پھر دیکھیں گے - یہ دوسری قسم کا سامان ہے جو ہماری گرمی اپنے ساتھ لاتی ہے

اس سے ایک دو روز بعد آپ ابھی صبح کی چائے پی رہے ہوں گے کہ ملازم کسی میجیکل پروفیسر کا وزیٹنگ کارڈ آپ کے سامنے لاکر رکھ دیگا۔ آپ باہر تشریف لے جائیں گے تو اپنے دفتر میں ایک اچھے خاصے پروفیسر نما جادوگر سے ملاقی ہوں گے۔ جو آپ کو دیکھتے ہی آپ کے سامنے ایک کتاب رکھ دیگا جسمیں راجاؤں۔ نوابوں۔ رئیسوں۔ خان بہادروں۔ ڈپٹیوں۔ وکیلوں۔ بیرسٹروں اور ایسوں ویسوں کے صدہا سرٹیفکٹ ہوں گے جن میں لکھا ہوگا کہ ان پروفیسر صاحب کے کرتب ضرور دیکھیئے۔ اور ان کے کمالِ فن کی داد دیجئے ؛

اگر ناظرین ابھی تک نہیں سمجھے تو ہم یہ سمجھانے کی تکلیف گوارا کر لیتے ہیں کہ میجیکل پروفیسر صاحب بھی ذات کے دیسی مداری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پڑھے لکھے ہیں اور موہوم آمدنی کے بھروسے پر چوک میں تماشہ نہیں دکھاتے۔ بلکہ اجرت پہلے مقرر کر کے کسی ہال میں شعبدہ بازی کرتے ہیں۔ ان حضرت کی تشریف آوری پر آپ کو اور بھی زیادہ یقین ہو جائے گا کہ گرمی آگئی ؛

اسی روز یا اس کے ایک دو روز بعد آپ اپنے دفتر میں بیٹھے کسی پیٹ کی دھندی میں لگے ہوں گے کہ ایک نہایت شریف وضع۔ مقطع اور مسبّح انسان جو سرتا پا انگریزی لباس میں ملبوس ہوگا۔ ایسی رسیلی آواز سے آپ کو گڈ مارننگ کہے گا کہ آپ فوراً تاڑ جائیں گے کہ یہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ وہ آپ سے کہے گا کہ جناب زندگی کا بیمہ کرا لیجئے (ورنہ مر جانے کا اندیشہ ہے) اور بیمے کے فوائد پر برزبان انگریزی اتنی فصیح و بلیغ تقریر کریگا کہ جواب میں آپ کی انگریزی آپ کو جواب دے جائے گی۔ اور آپ کے دلائل بھی اس کے دلائل کے سامنے پھیکے پڑ جائیں گے۔ لیکن آپ کو متردد دیکھ کر وہ کہے گا کہ آپ غور فرمالیں۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ چنانچہ بھوت کی طرح وہ آپ کے سر پر ایسا سوار ہوگا کہ کوئی دن خالی نہ جائیگا۔ حتیٰ کہ آپ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصّہ بیمہ کمپنی کی نذر کرنے

پر مجبور ہو جائیں گے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ ان حضرت کی آمد گرمی کی آمد کی گویا ایک اور دلیل ہے۔

اسی پر بس نہیں۔ مختلف قومی کالجوں۔ سکولوں۔ مسجدوں۔ مندروں۔ گئو شالوں۔ پاٹھ شالوں۔ انجمنوں۔ سبھاؤں اور یتیم خانوں کے سفیر (جن میں بعض اصلی اور اکثر جعلی اور نقلی ہوں گے) چندہ لینے کی غرض سے ایک ایک دو دو روزانہ کے حساب سے آپ کے پاس تشریف لائیں گے اور باوجود آپ کے تمام حیلوں اور تمام حجتوں کے آپ کو تلاش کرکے چھوڑیں گے۔ پہلے نہیں۔ یہ ایک اور تحفہ ہے۔ جو ہماری گرمیاں ہمارے لئے لاتی ہیں۔

آپ ابھی کسی چندے والے سے جان چھڑانے کی تجاویز سوچ رہے ہوں گے کہ باہر سے بین کی آواز آئے گی۔ اتنے میں ایک عجیب ہیئت کا انسان آپ کے سامنے آکر بیٹھ جائے گا۔ اور نہایت مؤدبانہ لہجہ میں کہیگا کہ حضور کچھ "کیڑے" لایا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ بین بجایا جائیگا اور مختلف قسموں کے سانپ نکال نکال کر آپ کے سامنے رکھا جائیگا۔ اور جب تک کچھ رہ بود کرنے لگا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ یہ ایک اور نشان ہے اس امر کا کہ میدانی ملکوں میں گرمی زور پر آگئی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ گرمی آئی اور ساتھ کیا لائی۔ جونکوں والے۔ مداری میجک پروفیسر۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ۔ چندہ جمع کرنے والے اور سپیرے۔ انہی غریبوں پر کیا موقوف ہے گرمیاں آتے ہی پنجاب اور صوبہ سرحد کے نواب۔ خان بہادر۔ ڈپٹی۔ جج۔ منصف۔ وکیل بیرسٹر۔ تاجر۔ سادھو۔ فقیر۔ سرکس والے (تھیٹر کمپنی کبھی نہیں آئی) تپ دق والے متعلقہ محکموں کے سب انسپکٹر۔ ہیڈ ماسٹر اور پروفیسر سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں آموجود ہوتے ہیں۔

جس طرح اور تمام چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک بڑی قسم کی اور ایک چھوٹی قسم کی۔ اسی طرح پروفیسر بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک بڑی قسم کے اور ایک چھوٹی قسم

کے مثلاً اگر دو بھائی شامت اعمال سے پروفیسر ہو گئے تو بڑے بھائی بڑی قسم کے پروفیسر ہوں گے اور چھوٹے بھائی چھوٹی قسم کے پروفیسر۔ ہم آئندہ بڑی قسم کے پروفیسر کو بڑے پروفیسر صاحب اور چھوٹی قسم کے پروفیسر کو چھوٹے پروفیسر صاحب کہیں گے :

گزشتہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ دروغ برگردنِ راوی (کہ ایں سوتے لاہور است) جولائی کی بائیس تاریخ تھی کہ چھوٹے پروفیسر صاحب کا تار ہمیں اس وقت ملا جبکہ ہم ایک عدالت میں کھڑے باتوں باتوں میں اپنے موکل کی فیس ہضم کر رہے تھے۔ تار میں لکھا تھا کہ مابدولت شام کی گاڑی سے تشریف لا رہے ہیں۔ اور آپ کے لئے بہت سی کتابیں بھی ساتھ لا رہے ہیں بس اور کیا چاہیئے تھا۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ ہمیں تو بلانے کے لئے کتابوں کا نام لینا کافی تھا۔ اور پھر یہ کہ بہت سی کتابیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ چھوٹے پروفیسر صاحب کے آنے کی اطلاع تھی جن کے واسطے ہم ہر وقت چشم براہ رہتے تھے۔ گو بڑے پروفیسر صاحب کئی روز پہلے سے آئے بیٹھے تھے لیکن وہ تھے سراسر ایم۔ ایس۔ سی۔ پہلے تو لتے تھے پھر بستے تھے۔ ہم ہوئے اتے۔ آباد کے مشہور یاوہ گو اور بیہودہ شنو۔ لغویات علمی اور واہیات ادبی ہماری روحانی غذا ٹھہری۔ بھلا ہم ان تلی جچی باتوں سے کیا حظ اندوز ہوتے!

پس شام ہوتے ہی ہم تمام دینی (؟) اور دنیاوی کام چھوڑ کر سردار صاحب کے موٹر میں چودھری صاحب کو ہمراہ لئے سیدھے سٹیشن پر جا پہنچے۔ (جو شہر سے دس میل کے فاصلہ پر ہے) انتظار کا ایک ایک لمحہ (اگر آپ نے کبھی کسی کا انتظار کیا ہو گا تو معلوم ہو گا) سال سال بھر کا ہوتا ہے۔ بہر کیف انتظار کی گھڑیاں کٹ گئیں اور ریل گاڑی سٹیشن پر پہنچ ہی گئی۔ اب چھوٹے پروفیسر صاحب اور ان کے ساز و سامان کی کیفیت سنیئے کہ علاوہ دیگر سامان اور کتابوں کے آٹھ دس بکسوں کے ایک بکس ہارمونیم باجے کا تھا۔ ایک بکس طبلوں کا۔ ایک تھیلا (قدآدم کے برابر) ستار کا اور دوسرا تھیلا (قدآدم سے بھی زیادہ) دلربا کا۔ یہ دبلے پتلے جسم کے گندم رنگ سرو قد چھوٹے پروفیسر صاحب رومی ٹوپی بند گلے

کے لمبے اچکن وضع کوٹ اور شلوار کے ساتھ (اور بااین ہمہ ساز و سامان) ایک عجیب و لفریب چیز نظر آتے تھے ؛

مختصر یہ کہ گرمیوں کے ان دو اڑھائی مہینوں میں یا چھوٹے پروفیسر صاحب تھے اور یا ہمارے یارانِ طریقت۔ چودھری صاحب اور مہتہ صاحب اور سردار صاحب۔ دن رات مجلس گرم رہتی تھی۔ چھوٹے پروفیسر صاحب کے علمی اور ادبی لطیفوں۔ اُن کے طبلے کی تھاپوں، ہارمونیم، ستار اور دلربا کی تانوں اور موسیقی کے دلکش اور باریک ترانوں کی آوازیں آج تک کانوں میں گونج رہی ہیں خصوصاً جب وہ ہمارا یہ شعر

دیر شش مرا داست و کعبہ مر مایش
مومن دلِ من کافر دلِ من

ستار پر مقامات زیر میں گایا کرتے تھے تو ہم پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ ایک تو شعر ہمارا اور پھر کہنے والے ہمارے چھوٹے پروفیسر صاحب۔ کبھی کبھی جب شاہ صاحب ہارمونیم پر۔ میاں چھٹن ستار پر۔ چھوٹے پروفیسر صاحب (طبلوں کی) جوڑی پر۔ گورکھا بابو وایولن پر بالاتفاق لگ جاتے تھے تو سڑک پر چلنے والے رہرو بھی جھومنے لگ جاتے تھے ؛

یہ چھوٹے پروفیسر صاحب بھی دستِ قدرت کے ایک عجیب شاہکار ہیں۔ طبیعت اس قدر انتھک کہ دن بھر ایک لحظہ بیکار نہ بیٹھتے تھے انگریزی کتابیں پڑھتے پڑھتے اکتا گئے تو فارسی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ پڑھنا چھوڑا تو لکھنا شروع کر دیا۔ لکھنا چھوڑا تو جوڑی لے کر بیٹھ گئے۔ انگلیوں نے جواب دیا تو ستار لے بیٹھے۔ ستار کو ایک کونے میں رکھا تو دلربا کے ساتھ دل بہلانے لگے۔ ادھر سے دل اٹھا تو ہارمونیم سامنے رکھ لیا۔ شانِ خدا! مشاغل یہ۔ نہ کوئی ورزش۔ نہ صبح شام کی سیر۔ پھر کھانے پر بیٹھیں

تو دو اڑھائی سیر گوشت (صرف بھونا ہوا) اکیلے کھا جائیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء
یہ شاید فارسی کے ایم۔ او۔ ایل ہونے کی برکت ہے۔ ورنہ صرف انگریزی کے ایم۔ اے تو ہم
نے اور بھی کئی دیکھے ہیں ؎

ادبی دنیا کے رہنے والے انسانوں کی شکل و شباہت کے متعلق لوگوں کے قیاس عجیب و غریب نوعیت کے ہوتے ہیں۔ آپ نے اگر کسی مصنف کی کوئی کتاب پڑھ لی یا کسی شاعر کی کچھ نظمیں دیکھ لیں۔ یا کسی مضمون نگار کے چند مضمون کسی رسالے میں ملاحظہ فرما لئے تو بس آپ نے فالفور اس مصنف یا شاعر یا مضمون نگار کے قد و قامت خد و خال اوضاع و اطوار اور لباس کے متعلق ایک ذہنی تصویر اپنے دل میں کھینچ لی۔ پھر جس وقت آپ اس کا نام سنیں گے یا اس کی کوئی تحریر پڑھیں گے تو وہ فوراً موہوم حلیہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔ یہ مشق بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچ گی کہ آپ کو عینی یقین ہو جائے گا کہ وہ کم بخت مضمون نویس یا شاعر یا مصنف فی الحقیقت اسی شکل کا انسان ہے۔ گویا آپ نے اُسے کئی بار دیکھا ہے۔ سوئے اتفاق سے اگر کہیں آپ کی اس سے ملاقات ہو گئی تو وہ تمام طلسم ٹوٹ جائیگا۔ اور آپ اس قدر مایوس ہوں گے کہ توبہ ہی بھلی۔ آپ نے سُنا نہیں کہ پچھلے دنوں مولانا نیاز۔ علامہ اقبال کو دیکھ کر اسی طرح مایوس ہوئے تھے اور یہ مایوسی ایسی پریشان کن تھی کہ مولانا کے حواس بجا نہ رہے ؎

اسی طرح ہماری کتابیں خریدنے والے۔ ہماری نظمیں پڑھنے والے اور ہمارے مضمون دیکھنے والے کبھی کبھی ہماری تیرہ بختی سے ہم سے ملنے بھی آجاتے ہیں اور ہمیں دیکھ کر ہمیشہ مایوس ہوتے ہیں ان میں سے کئی اصحاب جن کی طبیعت کی افتاد قدرے بے تکلف ہوتی ہے ہمارے منہ پر ہمیں کہہ دیتے ہیں کہ ۔۔۔ ۔۔۔ صاحب آپ کو دیکھ کر

بڑی مایوسی ہوئی۔ اس وقت یہی جی میں آتی ہے کہ ان کی بے تکلفی کا جواب ایسا بے تکلفی سے دیا جائے کہ دیوان سوزنی کا نثر میں جواب کہلا سکے۔ لیکن آپ ہی انصاف کریں کہ انسان کس کس سے لڑے اور کہاں تک لڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اب تک حکیم صاحب سے یہ درخواست نہیں کی کہ ہلا فوٹو رسالے میں چھاپ دیجیے۔ خیال آتا ہے کہ تھوڑی بہت بنی ہے۔ بنی ہے ؛

ہم حیران ہیں کہ یہ لوگ یہ غائبانہ تصویریں دل میں کیوں کھینچ لیتے ہیں اور پھر اس بات پر مصر ہوتے ہیں کہ وہ شاعر یا ناثر جب کبھی اُن کے سامنے آئے اپنی واقعاتی صورت کو گھر چھوڑ آئے اور ان کی خیالاتی تصویر بن کر ان کے سامنے پیش ہو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ادبی فضا میں نشوونما پانے والے ذی روح یعنی کتابیں یا نظمیں یا مضمون لکھنے والے انسان تمام تر باغ بہشت سے بھاگے ہوئے حور و غلمان ہوں یا دشتِ نجد سے نکالے ہوئے قیس عریان ؛

مثلاً (آپ انصاف کریں) ہم نے آج تک مولانا ... کو نہیں دیکھا (نام لے کر کون لڑائی مول لے) صرف ان کی حسین و جمیل ادبیات کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا ہم اُن کے متعلق دل میں یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اُن کا پندرہ یا سولہ برس کا سن ہوگا۔ سرو قامت ہوں گے (اور قد رعنا میں وہ سبج دھج ہوگی کہ قیامت بھی دیکھ کر شہید ہو) رفتار سے کبک دری کو شرمندہ کرتے ہوں گے (اور موجِ خرام کیا کیا گل نہ کترتی ہوگی) آنکھیں مست ہوں گی۔ (اور ہزار ہا میکدے آپ کی چشم نیم باز کی گردش کے ہمرکاب ہوتے ہوں گے) صراحی دار گردن سفید صاف اور شفاف ہوگی (پانی پیتے ہوں گے تو گلے سے اترتا نظر آتا ہوگا) رخسار بہشتی پھولوں کا گلدستہ ہوں گے (اور اگر ذرا پی لیتے ہوں گے تو چہرہ فروغ مے سے سعدی کی گلستاں بن جاتا ہوگا) پلکیں تیر و خنجر سے خونریز تر ہوں گی

(اور کبھی سرمہ لگا لیتے ہوں گے تو دشنۂ مژگاں کی تیزی امتحان کے قابل ہوتی ہو گی) محراب ابرو سجدہ گاہ عشاق ہو گا (اور اسے دیکھ کر عاشقوں کی جبین نیاز میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سجدے تڑپ اٹھتے ہوں گے) سُرخ ہونٹوں کی آب و تاب کے تصور میں لعل بدخشانی ہزاروں کوس دور کان میں پڑا ہوا کانپ جاتا ہو گا۔ ان کے دُرِ دنداں کا خیال آتا ہو گا تو بحر اوقیانوس کی پُر سکون گہرائیوں میں کتنے شاہوار موتی بطنِ صدف کے اندر ہی اندر مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتے ہوں گے۔ سبزۂ خط کی دلآویزی کا وہ عالم ہو گا کہ خود رضوان کبھی اس کو اور کبھی چمن فردوس کے حواشی کو دیکھتا ہو گا۔ (گویا اس اصل سے اس نقل کا مقابلہ کر رہا ہے) اور ہونٹوں کے نزدیک ضرور ایک تل بھی ہو گا جسے بعض لوگ دیکھ کر حیران ہوتے ہوں گے کہ یہ آگ پر بارود کا دانہ کیسے پڑا ہے اور بعض لوگ دیکھ کر خیال کرتے ہوں گے کہ حوض کوثر کے کنارے پر حضرت بلال کھڑے ہیں اور بعض نکتہ شناس آدمی اسے صفحۂ عارض پر نقطۂ انتخاب سمجھتے ہوں گے اور اگر ظہیر فاریابی زندہ ہوتے تو اسے دیکھ کر فی البدیہہ یہ کہہ اٹھتے کہ

بیکے خالِ سیاہ جاکردہ بر کنجِ لب لعلش
تو گوئی بر لبِ آبِ بقا بنشستہ ہندوئے

اب اگر آتشِ شوق تیز ہو جائے اور ہم مولانا ... ... کو دیکھنے ... ... چلے جائیں اور وہاں پہنچ کر جب انھیں دیکھیں تو ہماری تمام امیدوں پر پانی پھر جائے اور ایک حد درجہ غیر شاعرانہ صورت نظر آئے۔ تو فرمائیے اس میں قصور ہمارا ہے یا مولانا ... ... کا

یا مثلاً ہم نے آج تک علامہ ... ... کو نہیں دیکھا (نام لے کر بے ادبی کیوں کریں) صرف اُن کی فلسفیانہ اور قومی درد سے بھری ہوئی نظمیں پڑھی ہیں۔ تو کیا ہم ان کے متعلق یہ خیالی نقشہ دل میں بنا سکتے ہیں کہ سن شریف نوّے سے متجاوز ہو گا۔ قد فلسفے کے بوجھ سے جھک کر کمان بن گیا ہو گا۔ چلتے ہوں گے تو عصا کے سہارے نہایت آہستہ

آہستہ قوم کے درد میں رات دن رو رو کر آنکھیں خراب کر لی ہوں گی۔ سر اتنا وزنی ہوگا کہ گردن اس کے بوجھ سے دب گئی ہوگی۔ چہرہ زرد ہوگا۔ گوشت کا نام نہ ہوگا۔ ہڈیاں نکلی ہوئی ہوں گی۔ سیل اشک کی روانی کے نشان دونوں رخساروں پر عیاں ہوں گے۔ پلکیں جھڑ چکی ہوں گی۔ ابرُو لٹکتے لٹک گئے ہوں گے کہ جب تک ان کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے نہ ہوں گے۔ کچھ دیکھ نہ سکتے ہوں گے۔ ہونٹ خشک ہوں گے۔ منہ میں ایک دانت نہ ہوگا (صرف قوم کا غم کھاتے ہوں گے) کھانا کھانے سے بے نیاز ہوں گے۔ داڑھی سفید ہوگی لیکن بال صرف اتنے ہوں گے کہ انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ کمر سے اوپر کا لباس فلسفیانہ ہوگا۔ اور نیچے کا شاعرانہ جس مکان میں رہتے ہوں گے اس کی چھت نیم فلسفیانہ ہوگی اور نیم شاعرانہ۔ متعلقین نصف شاعر ہوں گے اور نصف فلسفی۔ ماتھے سے فلسفیانہ نور کی کرنیں اٹھ اٹھ کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چُندھیا دیتی ہوں گی۔ چہرے کی شاعرانہ روشنی رات کو دن بنا دیتی ہوگی۔ بات چیت کرتے ہوں گے تو ایسا معلوم ہوتا ہوگا کہ کوئی مصری قاری کلام مجید پڑھ رہا ہے۔

پھر اگر ہمیں کبھی ..... جانے کا اتفاق ہو جائے اور وہاں علامہ ..... کے ملنے کا موقعہ بھی مل جائے۔ تو یہ دیکھ کر کہ وہ ہماری اس ذہنی تصویر کے خلاف ایک ہشاش بشاش خوش صورت۔ خوش وضع درمیانی عمر کے ایک آدمی ہیں۔ ہمارا کیا حق ہے کہ ہم اُن سے رُوٹھ جائیں اور گھر آکر اُن کو کوسنا شروع کر دیں۔

بارے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم (یعنی عابد ولت صاحب) اور چھوٹے پروفیسر صاحب اور بڑے پروفیسر صاحب ایک دوسرے کو دیکھ کر کبھی مایوس نہیں ہوئے اور ہوں بھی کیوں ہم مصنف ہیں لیکن قد و قامت مصنفانہ نہیں۔ شاعر ہیں لیکن خد و خال شاعرانہ نہیں مضمون نگار ہیں لیکن وضع قطع اور لباس مضمون نگارانہ نہیں۔ چھوٹے پروفیسر صاحب انگریزی

کے ایم۔ اے ہیں لیکن شکل انگریزی نہیں۔ فارسی کے ایم۔ او۔ ایل ہیں لیکن صورت فارسی نہیں۔ ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ کے مالک ہیں۔ لیکن چہرہ کتابی نہیں۔ فن موسیقی کے ماہر ہیں لیکن قطع و بُرید قطعاً تان سینی نہیں۔ بڑے پروفیسر صاحب مشہور مصنّف ہیں لیکن شکل وصورت بالکل انسانوں کی سی۔ پرلے ایم ایس سی ہیں لیکن خط وخال بالکل غیر سائنٹفک۔ پرلے استاد ہیں لیکن مشاغل بالکل غیر طالب علمانہ ۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ہرگز مایوس نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کہ اگر ہم ایسے ہیں تو یہ بھی بالکل ویسے ہی ہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذلک ۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ گزشتہ گرمیوں کی یہ مُروح پرور صحبتیں چشم زدن میں گزر گئیں۔ کیا خوب کہا ہے مرقع چغتائی والے غالب نے ؎

گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

گرمیاں گزر گئیں اور سردیاں شروع ہو گئیں۔ جونکوں والے چلے گئے۔ مداری چلے گئے۔ میجیکل پروفیسر چلے گئے۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ چلے گئے۔ چندہ مانگنے والے چلے گئے۔ نواب چلے گئے۔ خان بہادر چلے گئے۔ ڈپٹی چلے گئے۔ جج چلے گئے۔ منصف چلے گئے وکیل اور بیرسٹر چلے گئے۔ تاجر چلے گئے۔ سادھو فقیر اور سرکس والے چلے گئے۔ تپ دق والے کوئی یہاں ہی مر گئے اور کوئی واپس چلے گئے۔ انسپکٹر ہیڈ ماسٹر اور پروفیسر چلے گئے رہ گیا صرف خدا کا نام اور خدا کے نام لیوا لے۔ آبادی ۔

اب سنیئے کہ سردی اپنے ساتھ کیا لائی۔ صرف برف۔ گلیوں میں برف ہے سڑکوں پر برف ہے۔ چھتوں پر برف ہے۔ درختوں پر برف ہے۔ شہر کی پہاڑیوں پر جہاں موسم گرما میں صنف نازک کے بے شمار ریوڑ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اب برف ہے اور صرف برف ہے زمین و آسمان سفید ہیں۔ بادل سفید ہیں۔

اور تمام فضا سفید ہے۔ وہی اے آباد جو گرمیوں میں فردوس بریں کا ایک ٹکڑا نظر آتا تھا اور جس کی سرسبز پہاڑیاں رنگا رنگ پھولوں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے چمن۔ سرو صنوبر۔ دیودار اور یوکلپٹس۔ سفیدے اور چنار۔ وادیٔ کشمیر کے دلفریب مناظر کو بھی شرمندہ کرتے تھے۔ آج سنسان پڑا ہے اور زمہریر کا خطہ بن گیا ہے۔ بند کمروں میں انگیٹھیاں جل رہی ہیں اور بچے، جوان اور بوڑھے ان انگیٹھیوں کے گرد اگرد بیٹھے آتش پرستی کر رہے ہیں۔ کاش وہ لوگ جو اے۔ آباد میں گرمی بسر کرنے آتے ہیں یہاں کی سردی بھی آکر دیکھیں اور قدر عافیت معلوم کریں ؎

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہار بھی ایسی ہی خزاں کے بعد آتی ہے جہاں ایسی خزاں نہیں وہاں بہار بھی نہیں۔ میدانی ملکوں کے لوگ تو بہار کا مفہوم ہی نہیں جانتے۔ معلوم نہیں وہ غزلوں میں بہاریہ اشعار پڑھ کر کیا سمجھتے ہوں گے۔ ہم سکول میں پڑھتے تھے تو نظم کی کتابوں کے ساتھ سکول ماسٹروں کی بنائی ہوئی ان کتابوں کی فرہنگیں بھی خرید لیا کرتے تھے۔ یہ فرہنگیں ہماری معلومات میں جو اضافہ کرتی تھیں اور ان کے ذریعے اشعار کے سمجھنے میں جو مدد ہمیں ملا کرتی تھی اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

عقیق۔ ایک قیمتی پتھر کا نام ہے ؎

لعل رمانی۔ ایک قیمتی پتھر کا نام ہے ؎

یاقوت۔ ایک قیمتی پتھر کا نام ہے ؎

صنوبر۔ ایک درخت کا نام ہے ؎

شمشاد۔ ایک درخت کا نام ہے ؎

لالہ۔ ایک پھول کا نام ہے ؎

ریحان۔ ایک پھول کا نام ہے ؎

یاسمن - ایک پھول کا نام ہے ؛
عنبر - ایک مشہور خوشبو کا نام ہے ؛
مشک - ایک مشہور خوشبو کا نام ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب اس فرہنگ کی مدد سے مندرجہ ذیل اشعار کو سمجھیئے اور ان سے بہرہ اندوز ہونے کی کوشش فرمایئے۔ خاک بھی نہ سمجھئے گا۔

گر عقیق لب او در دہنم آب شود
عاشق تشنہ محال است کہ سیراب شود

ز چشم لعل رمانی چو مے بنید مے خندند
ز رویم راز پنہانی چو مے بنید مے خوانند

یاد باد آنکہ چو یاقوت قدح خندہ زدے
درمیان من و لعل تو حکایت ہا بودے

چندان بود کرشمہ و ناز سہی قدان
کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

نسیم لطف تو در باغ دامنے بفشاند
دمید نکہت عنبر ز طرۂ شمشاد

چو لالہ چشم سیہ از خمار داری سرخ　　پیالہ تا بسحر دوش در کجا زدۂ

یکے ست آمدن و رفتن سبک وحاں
عزیز دار ریاحین بوستانی را

دلبرے چوں تو ندیدیم بنازک بدنی
کہ شود از نگہ گرم رخت یاسمنی

مشک برداغ دل سوختگاں افشاند
سرمہ چوں از کف مژگاں سیاہش ریزد

بعینہٖ یہی کیفیت ہے اُن لوگوں کی جنھوں نے بہار کی اصلی بہار کبھی نہیں دیکھی اور بہاریہ اشعار پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔ ہمارے بڑے پروفیسر صاحب اور ہمارے چھوٹے پروفیسر صاحب اور میدانی علاقوں کے دیگر صاحبان بہاریہ نظمیں پڑھتے بھی ہیں اور سُنتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ لیکن وہ یقین جانیں کہ اگر ایک دفعہ وہ ایسی بہار جو صحیح معنوں میں بہار کہلا سکتی ہو۔ دیکھ لیں تو پھر بہاریہ اشعار سے جو لطف انہیں حاصل ہوگا۔ وہ پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا ؛

لیکن معاذ اللہ اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ یہ حضرات موسم بہار بھی یہاں آکر گزاریں اور برفانی علاقے بھی بہت ہیں۔ کہیں جا کر دیکھ لیں۔ باقی عند التلاقی ؛

یٰاَیُّھَا الْمُنَافِقُوْن

یعنی اے وارڈ ×کے وہ مُسلمانو! (خواہ تم ریش دار قسم کے مسلمان ہو یا بے ریش قسم کے مسلمان اور خواہ تم سفید ریش ہو یا سیاہ ریش ہو یا سرخ ریش) جنہوں نے وعدہ کسی اور سے کیا اور ووٹ کسی اور کو دی۔ یاد رکھو کہ تمہاری خفیہ ووٹ پر وہ دونوں بدظن ہیں اور اس لئے دھوبی کے اس جانور کی طرح جس کے متعلق داناؤں کا قول ہے کہ نہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔ تم بھی نہ ادھر کے ہوئے اور نہ ادھر کے رہے۔ تمہاری اس کس مپرسی پر رحم آتا ہے اور منافقت پر غصہ۔ یقین جانو کہ جب تک ملک میں تم اور تمہارے ہم مشرب لوگ موجود ہوں گے ہندوستان کو اصلاحات کے نفاذ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اپنے ایمان کو استوار کرو اور جھوٹے وعدوں سے پرہیز۔ پھر دیکھو کہ تمہاری قوم اقوام عالم میں کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اور تمہارا ملک کس قدر ترقی کرتا ہے کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری یہ دورخی شہر میں اور پھر شہر سے نکل کر ملک میں دشمنی اور فساد کا بیج بوتی ہے اور دوستوں کو دشمن بناتی ہے۔ سید اکبر مرحوم نے سچ کہا تھا؂

حکومت پارلیمنٹی بناشد اندریں کشور
ڈیلے ٹیٹو بجنگ آید بہم از بہر کونسلہا

لیکن غور سے دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ اس خانہ جنگی کی ذمہ دار اصلاحات نہیں بلکہ تم خود ہو۔ چائے کی ایک پیالی پر یا پلاؤ کی ایک پلیٹ پر یا چاندی کے چند دندانہ دار گول ٹکڑوں پر ووٹ کا فیصلہ کرنا حقیقتاً ضمیر کشی بلکہ ایمان فروشی ہے۔

اے وارڈ ۸ کے ہندوؤ! (خواہ تم مرزائی قسم کے ہندو ہو خواہ غیر مرزائی قسم کے ہندو اور خواہ تم وہابی المذہب ہو خواہ غیر وہابی المذہب) جنھوں نے کہا کچھ اور کیا کچھ اور جنھوں نے دونوں امیدواروں کو خوش کیا یا سچ پوچھیئے تو دونوں امیدواروں کو ناخوش کیا جنھوں نے ایک کو امید دلائی اور دوسرے کی مدد کی اور جنھوں نے ضمیر پر نہیں بلکہ ضد پر اڑ کر ووٹ دی۔ کانوں کو اچھی طرح کھول کر سنو کہ تمہاری یہ ضمیر فروشی اور ضد پرستی خود تمہاری قوم کے مفاد و مقاصد کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے ۔

(نوٹ) ناظرین ہندوؤں کے مرزائی یا وہابی ہونے پر حیران نہ ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ضلع پشاور کے ایک پیر صاحب ایک روز اپنے معتقدین کے حلقے میں بیٹھے تھے کہ ایک مرید نے آکر ایک ہندو دکاندار کی بدسلوکی کی شکایت کی۔ آپ شکایت سنکر نہایت برآشفتہ ہوئے۔ اور فرمایا کہ تم لوگ اس ہندو کی دکان پر کیوں جایا کرتے ہو۔ یہ تو وہابی ہے بس اور کیا چاہیئے تھا پیر صاحب کے اس ارشاد کا گاؤں میں چرچا ہوا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمانوں نے اس ہندو کی دکان سے سودا خریدنا قطعاً بند کر دیا۔ تین چار روز کے بعد ہندو کو جب مقاطعہ کی وجہ معلوم ہوئی تو فوراً کچھ شیرینی اور کچھ نقدی لیکر پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی مانگی۔ دوسرے روز پیر صاحب نے پھر بر سر اجلاس اعلان فرمایا کہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ہندو وہابی نہیں ہے۔ اس پر پھر اس ہندو کی دکان چلنے لگی اور معاملہ رفت گذشت ہوگیا ۔

اسی طرح اگر آج ہماری جامع مسجد کے مولانا الخطیب صاحب اعلان فرما دیں کہ لالہ کشن لال صاحب مرزائی ہیں تو کل مسلمان ان کی دکان کا مکمل بائیکاٹ کر دینگے

اور

اے وارڈ ۸ کے وہ امیدوار و! (خواہ تم میونسپل کمیٹی کی ممبری کے امیدوار ہو خواہ کونسل کی ممبری کے اور خواہ تم ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری کے امیدوار ہو خواہ اسمبلی کی

ممبری کے) جنھوں نے قوم کے سامنے کچھ اور پروگرام رکھا اور دل میں کچھ اور۔ جنھوں نے اپنے حریف کے خلاف تہذیب۔ ایمان اور ضمیر کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر سراپا جھوٹا پراپیگنڈہ کیا۔ جنھوں نے ایک ایک ووٹ کی خاطر ایسے ایسے ووٹروں کے سامنے جا کر اپنے آپ کو ذلیل کیا جن کے سلام کا جواب دینا تمہارے لئے موجب عار ہوتا تھا۔ جنھوں نے ذاتی فضائل کے زور سے نہیں بلکہ روپیہ، جھوٹ اور خوشامد کے زور سے ممبری حاصل کی یقین جانو کہ حق و صداقت ہر وقت تم پر لعنت بھیج رہے ہیں ؛

پس اے لیسے ووٹرو اور اے لیسے ممبرو اور ایسے ناکام امیدوارو! ذرا کان دھر کے سنو کہ ہم نے کہا ہے ؎

ریفارمز آ گئی ہیں صاحب، للاں خدا را — بغض و نفاق یاراں خواہد شد آشکارا
کھاتے ہیں کیک ووٹر بنتا ہے شہر سارا — آخر نتیجہ نکلا اک جیتا ایک ہارا
جب اس نے ہار پہنے وہ دُم دبا کے بھاگا
پچھوے کی دُم میں تاگا[1]

امیدوار گھر گھر پھرتا ہے مارا مارا — ووٹر کی جستجو میں مجنوں ہوا بچارا
چھوٹی نہ اس سے سجادہ، مسجد نہ گوردوارا — ووٹر کا دل ہے لیکن مانند سنگ خارا
دیکھا اسے جو آتے آنکھیں چرا کے بھاگا
پچھوے کی دُم میں تاگا

امیدوار دو ہیں ووٹر کی ایک جان ہے — یہ بھی ہے دوست اس کا اور وہ بھی مہرباں ہے
اس کا خیال بھی ہے اور اسکا بھی دھیان ہے — دونوں ہیں اس سے راضی لیکن یقیں کہاں ہے
دی خفیہ ووٹ جا کر اور جاں بچا کے بھاگا
پچھوے کی دُم میں تاگا

[1] نیا محاورہ ہے۔

ہندو سے جا کے کہنا میں داس ہوں تمہارا ہیں آپ میرے پیارے میں آپ کا ہوں پیارا
پھر جا کے مومنوں سے گانٹھا یہ بھائی چارا خادم کو ہے عزیزو بس آپ کا سہارا
ہر انجمن میں جھوٹی باتیں بنا کے بھاگا
کچھوے کی دم میں تاگا

ووٹیں بھی بک رہی ہیں پیسے کا زور دیکھو ہر کوی ورگنہ میں برپا ہے شور دیکھو
شب بھر گھروں سے باہر ووٹوں کے چور دیکھو رستہ ٹٹولتے ہیں مانند کور دیکھو
غافل ہوا ذرا یہ وہ ووٹ اڑا کے بھاگا
کچھوے کی دم میں تاگا

وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ وغیرہ (یعنی چار بند اس نظم کے ابھی اور ہیں)

اور

اے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (یا ٹکسالی اردو میں گول میز کانفرنس کے)

وہ دلی گیٹو کہ باہر آپ کے اخبار زمیندار اور اخبار سیاست اور اندر آپ کے ڈبی بازار ہے اور اے اسی کانفرنس کے شاہ عالمی گیٹو کہ باہر آپ کے اخبار انقلاب اور اندر آپ کے خدا جانے کیا کچھ ہے اور اے اسی کانفرنس کے لوہاری گیٹو کہ باہر آپ کے کچھ اخبار بکتے اور کچھ اخبار بکتے ہیں جنھوں نے ولایت پہونچکر ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ لیا ہے۔ اگر تم مسلمان ہو تو بتاؤ کہ سپین کی اسلامی سلطنت کو کس نے تباہ کیا۔ سسلی سے مسلمانوں کو کس نے نکالا طرابلس اور مراکش کی اسلامی سلطنتوں کو کس نے برباد کیا۔ مصر کا ملک مسلمانوں سے کس نے چھینا۔ ایران اور افغانستان کا شیرازہ کس نے بکھیرا۔ ٹرکی کی عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کس نے کئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو کس نے غلام بنایا۔ اگر ان تمام سوالوں کے جواب میں تم کہہ سکتے ہو کہ یہ سب کچھ ہندوؤں

نے کیا۔ تو پھر جو کچھ تم اس وقت ولایت میں بیٹھ کر کر رہے ہو۔ وہ درست اور بجا ہے ورنہ جو کچھ تم وہاں کر رہے ہو ناروا ہے اور مطلق ناروا۔ تم نہ خود کچھ کر سکتے ہو اور نہ کسی اور کو کچھ کرنے دیتے ہو جیسا کہ ہم نے کہا ہے ع

خوردن نہ ہم خود ہم نخورم ایں ہم نکنم آں ہم نکنم

اور اگر تم ہندو ہو تو سنو کہ تمہاری یہ مہاسبھائیت ہندوستان کی بربادی کا باعث ہوگی۔ مسلمانوں کے تمام مطالبات کو مان لو جو کچھ وہ مانگتے ہیں اس سے کچھ زیادہ ان کو دیدو۔ کیا مسلمان تمہیں کھا لیں گے۔ کیا وہ تمہیں ہندوستان سے نکال دیں گے اور کیا وہ ہندوستان کی دولت کو عربستان میں جاکر دفن کر آئیں گے اپنی اکثریت کو دیکھو اور شرماؤ۔ بزدلی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدو اور مظلوم ہندوستان پر رحم کرو۔ کیا تم اپنے غریب بھائیوں کا لاکھوں روپیہ خرچ کرکے ولایت اس لئے آئے ہو کہ انھیں آزاد کراؤ یا اس لئے کہ ان بیچاروں کے ہاتھ پاؤں کے لئے ولایتی کارخانوں سے زنجیریں بنوا لے چلو؟

اور

اے وہ ولایتی بیرسٹرو اور ہندوستانی بی۔ اے ایل ایل بیو! جنھوں نے وکالت کے پیشہ پر لیڈری کے پیشہ کو ترجیح دی ہے۔ بتاؤ کہ جب تم ایک غریب بے کس مظلوم ہندوستانی کا مقدمہ بغیر پیشگی فیس وصول کئے نہیں کر سکتے تھے تو پھر بد نصیب ہندوستان کی وکالت فیس لئے بغیر کس طرح کرتے ہوگے۔ خدا جانتا ہے تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ تم تنخواہ دار لیڈر ہو یہ اور بات ہے کہ تنخواہ تمہیں کون دیتا ہے قوم یا سرکار۔ اس میں شک نہیں کہ تمہاری زبان پر ہر وقت قوم ہی قوم ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تمہارے دل میں دن رات وکالت ہی وکالت ہے ان حالات میں یقین جانو کہ یہاں تمہاری لیڈری ناکام رہے گی اور وہاں تمہارا حشر

لیڈروں کے ساتھ نہیں بلکہ پلیڈروں کے ساتھ ہوگا۔ اور ایسا حشر تمہیں معلوم ہے کہ چنداں قابلِ رشک نہیں ؛

کریما بیخشائے برہندیاں | کہ ہستند اسیرِ چنیں لیڈراں
باغراضِ ملی نپرداختستند | کہ ایں لیڈراں باہوا ساختند
ازیں لیڈران پلیڈر صفات | چہ مے پرسی اے دوست راہ نجات
مکن راہ گم کردہ را راہبر | خصوصاً چو راہت بود پرخطر

اور

اے ہندوستان اور پارستان کے نقلی گاندھیو۔ فرضی نہرو۔ بناوٹی علی ماموں۔ جعلی ابوالکلامو۔ مصنوعی اجمل خانو اور خانہ ساز ظفر علی خانو اور بہائیو! کیا تم اندھے ہو کہ دیکھ نہیں سکتے یا قوم اندھی ہے کہ دیکھ نہیں سکتی کہ اصل اصل ہے اور نقل نقل۔ کیا ایثار اور نفس پرستی ہم رنگ چیزیں ہیں۔ کیا قربانی اور شکم پروری میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ اور کیا قومی خدمت اور جاہ طلبی ایک دوسرے کی جگہ لے سکتی ہیں۔ پھر اگر تم اپنے باطن کو اپنے ظاہر کے موافق نہیں بنا سکتے تو کم از کم اتنا تو کرو کہ اپنے ظاہر کو اپنے باطن کے مطابق بنالو۔ تاکہ نہ تم دنیا کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرو اور نہ دنیا تم کو بیوقوف بنا سکے۔ خدا کے لئے اس کلاعینت کو چھوڑ دو۔ یا تگ کبک کا خیال دل سے دور کر دو ورنہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہارے بال و پر نوچ ڈالے جائیں گے اور تمہیں بے دست و پا ہو کر رینگنے والے جانوروں میں شامل ہو جانا پڑے گا ؛

راہ پرخوف ہے اور منزلِ مقصود ہے دور
رہنما غولِ بیاباں ہے خدا خیر کرے

اور

اے اردو اخبار وں کے ودائیڈیٹرو! (خواہ تم مدیر مسئول ہو خواہ مدیر سائل) جھوٹی

اپنے اپنے اخباروں یا اپنی اپنی اخباروں میں ایک کالم بعنوان خرافات یا واہیات یا فاحشات یا لغویات یا کچھ اور آت لگا کر مقرر کیا ہے اور اس کالم کے ذریعہ روزانہ یا ہفتہ وار قوم کو بدزبانی اور بیہودہ گوئی کی تعلیم دے رہے ہو۔ کیا فن صحافت کی تکمیل سوا اس کے نہیں ہو سکتی کہ اخبار کے کالموں میں لوگوں کی پگڑیاں اتاری جائیں۔ مردوں کی تو خیر عورتوں کے ساتھ مسخر کیا جائے۔ اوروں کی غلطیاں مشتہر کر کے اپنے علمی فضائل کا بیان کیا جائے۔ بچارے کم بضاعت لکھنے والوں کا نام اور پتہ دیکر انھیں سربازار رسوا کیا جائے شرفا کی بہو بیٹیوں کی توہین کی جائے۔ اپنے حریفوں اور معاصروں کو ذلیل کیا جائے اور ٹکسالی اردو میں وہ وہ غلطات لکھے جائیں جو پنجابی میں بھی ادا نہ ہو سکیں۔ کیا علمی اور ادبی ظرافت یہی چیز ہے۔ کیا بھانڈ بنے بغیر آدمی ظریف نہیں کہلا سکتا۔ یہ خوش طبعی نہیں بلکہ بدطینتی ہے ابتدا اصلی اور ان دونوں چیزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ؎

ہر بو الہوس نے شوخ نگاری شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل ہنر گئی

اور

اے وہ اخبار نویسو! جو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے ہو اور اگر اس خانہ جنگی سے فرصت ملے تو ایک قوم کو دوسری قوم سے لڑاتے رہتے ہو کیا تمہیں معلوم ہے کہ جس غریب قوم کی جیبوں سے پیسے نکال کر تم موٹروں پر سوار ہوتے ہو اسے اپنی سواری کے لئے گدھا بھی نہیں ملتا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ خانہ جنگی کی یہ آگ جو تم نے لگائی ہے اور جس پر ہر روز تم تازہ تیل ڈالتے رہتے ہو۔ کسی وقت گھر کو جلا کر خاک سیاہ کر دیگی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ قوم کو سیاسی تعلیم دینے کے پردے میں تم قوم کو بداخلاقی اور بے دینی کی تعلیم دے رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم ملک کو حریت کی طرف نہیں بلکہ پیش از پیش غلامی کی طرف لے جا رہے ہو۔ خدارا ان اپنے دعووں پر غور کرو جو اخبار جاری کرتے وقت تم نے قوم

اور ملک کے سامنے پیش کئے تھے اور جن کا اعادہ تم ہر روز اخبار کے سرورق پر کرتے ہو۔ انصاف کرو اور کہو کہ جو کچھ اخبار کے باہر لکھا ہے کیا اخبار کے اندر بھی وہی کچھ ہے۔ اگر نہیں تو ایسا کیوں ہے۔ تمہاری بد دیانتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ سچی خبریں قیمتاً لینے کی بجائے جھوٹی خبریں مفت حاصل کرتے ہو۔ اور انھیں شائع کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہو۔ کیا یہ سچ نہیں کہ تمہاری برادری کے ایک بزرگ کو جب کاتب نے جا کر اطلاع دی کہ مقامی خبروں کے کالم میں چار سطریں خالی رہ گئی ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ جا کر لکھ دو کہ "ابھی اطلاع ملی ہے کہ مال روڈ پر دو موٹریں ٹکرا گئی ہیں۔ کئی آدمی زخمی ہو گئے ہیں جن میں سے ایک میو ہسپتال میں جا کر مر گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون" تھوڑی دیر کے بعد کاتب پھر واپس آیا اور کہا ایک سطر پھر خالی رہ گئی ہے آپ نے کہا کہ جا کر لکھ دو کہ "بعد کی اطلاع ہے کہ یہ افواہ غلط ہے"۔

اور

اے علمی ادبی تاریخی فلسفیانہ عاشقانہ اور رندانہ رسالوں کے وہ ایڈیٹرو جو صرف اس لئے رسالے نکالتے ہو کہ اپنا پیٹ پالو اور دعویٰ یہ کرتے ہو کہ ہم گھر کا سامان بیچ کر ملک کی علمی خدمت کر رہے ہیں اور جو اپنے رسالوں میں اکثر ایسے مضامین شائع کرتے ہو جن کا شائع کرنا اور شائع نہ کرنا برابر ہے اور بعض ایسے مضامین شائع کرتے ہو جن کا شائع نہ کرنا شائع کرنے سے بدرجہا بہتر ہے اور جو اپنے رسالوں میں تنقید علمی اور تنقید مذہبی کی عنوانوں کے نیچے بسا اوقات ریش بابا کے ساتھ بھی بازی کر جاتے ہو اور جو ایک دوسرے کو بازاری اور کمینہ گالیاں دیتے ہوئے نہ صرف شرماتے ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ اپنے اخلاق کی بلندی کے مدعی بھی بنتے ہو۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ جہاں تم اپنے ظاہر کی آراستگی کا بندوبست کر رہے ہو وہاں تمہارے باطن کی پراگندگی کا سامان بھی مہیا ہو رہا ہے اور جہاں تم اپنے ناظرین و ناظرات میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کر رہے ہو۔ وہاں ان کے

دلوں میں بے دینی اور بداخلاقی کا بیج بھی بو رہے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے رسالے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور حشرات الارض کی طرح فضائے عالم کو مسموم کر کے چند روز میں مر بھی جاتے ہیں۔

اور

اے ان رسالوں کے وہ مقالہ نگار و جو بے معنی کہانیاں لکھتے ہو یا بامعنی کہانیوں کا ترجمہ کر کے انھیں طبع زاد بتلاتے ہو اور جو بے معنی مضمون لکھتے ہو یا بامعنی مضمون چرا کر انھیں اپنے نام سے رسالوں میں بھیج کر اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ رسالوں کے ایڈیٹروں کو رسوا کرتے ہو اور جو محققانہ مقالے لکھ کر سکندر اعظم کو دارا کا بیٹا ثابت کرتے ہو اور جو تنقیدی شذرے سپرد قلم کر کے مؤلفین و مصنفین کا تمسخر اڑاتے ہو اور اگر اور کچھ نہ ملے تو تذکیر و تانیث کے جھگڑے بپا کرتے رہتے ہو۔ اور ان اشیاء کو جو حقیقتاً نہ مونث ہیں نہ مذکر بلکہ قطعاً مخنث ہیں۔ مذکر یا مونث لکھنے پر اصرار کرتے ہو۔ اگر خدا نے تمہیں لکھنے کی توفیق دی ہے تو کچھ مفید مطلب باتیں لکھو جن سے ناظرین کے معلومات میں اضافہ ہو۔ ایسی باتیں بنانے سے کیا فائدہ ہے جو نہ دنیا میں کام آئیں اور نہ عقبیٰ میں نجات کا موجب بن سکیں۔

اور

اے وہ مضمون نویسو! جو سو فیصدی یا کم از کم پچاس فیصدی مرد ہونے کے باوجود زنانہ نام رکھ کر زنانہ اور مردانہ رسالوں میں مضمون بھیجنے کے عادی ہو۔ دنیا کو دھوکا کیوں دے رہے ہو۔ کیا اس دھوکے سے تمہارے مضمون کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ کیا اس بہروپ سے خود تمہاری عزت دوچند ہو جاتی ہے۔ کیا اس قلب ماہیت سے رسالے کے خریداروں میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ یا کیا جن ناموں سے تم لکھتے ہو ان نام والیوں کو مشہور کرنا مقصود ہے؟ تم کتنے اچھے مضمون کیوں نہ لکھو یاد رکھو کہ جس چیز کی بنا فساد اور جھوٹ پر ہو اس میں یمن و برکت کا وجود مفقود ہوتا ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ لکھنے پڑھنے والیوں

کی تعداد روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ خود بیگمات کے طبقہ میں اچھا لکھنے والیاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ پھر تم اس بیہودہ حرکت کے مرتکب ہو کر دروغ کو فروغ دینے کی بے سود کوشش کیوں کرتے ہو۔ یہ تو کہو کہ اگر کوئی بھلے مانس تمہارے اس فریب کا شکار ہو کر تمہیں فی الواقعہ عورت ہی سمجھ بیٹھے تو کیونکر ہو؟

اور

اے شاعری کی پہلی کتاب اور شاعری کی دوسری کتاب پڑھ کر شعر لکھنے والے وہ شاعرو (کہ ہم خود بھی تمہارے زمرے میں شامل ہیں) جنہوں نے شعر کہنا اس لئے اختیار کیا ہے کہ نثر میں اتنا جھوٹ سما نہیں سکتا۔ یا اس لئے کہ مدحیہ قصائد لکھ کر صلہ حاصل کیا جا سکتا ہے یا اس لئے کہ ہجو لکھ کر دشمن کو رسوا کیا جا سکتا ہے یا اس لئے کہ شعر کے ذریعہ علامہ کہلایا جا سکتا ہے۔ یا اس لئے کہ سیاسی نظمیں لکھ کر لیڈر بنا جا سکتا ہے یا اس لئے کہ رطب و یابس جو نثر میں کوئی نہیں چھاپتا نظم میں چھپوا کر نام پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یا اس لئے کہ اپنی ہی نظموں سے اپنے رسالے کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے یا اس لئے کہ نظمیں لکھ کر کسی انٹرمیڈیٹ کالج کا پروفیسر بنا جا سکتا ہے۔ یا اس لئے کہ شاعری کے زور سے اپنا فوٹو یا اپنی فوٹو رسالوں میں چھپ یا چھپوائی جا سکتی ہے۔ یا اس لئے کہ نظمیں لکھ لکھ کر اپنے سوانح حیات (قبل از ممات) کسی رسالے میں شائع کرائے جا سکتے ہیں یا اس لئے کہ شاعری کے ذریعہ شعر ناشناسی کے دربار سے فصیح الزماں یا بقول شخصے بلیغ الدوراں کا لقب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یا اس لئے کہ شعر کی برکت سے ہر مجلس میں اپنی جگہ پیدا کی جا سکتی ہے یا اس لئے کہ جو بات نثر میں کہتے ہوئے حیا مانع آتی ہے وہ نظم میں بے تکلف کہی جا سکتی ہے جیسا کہ تمہارے ایک بھائی نے کہا ہے ؎

آنچہ نتواں گفتمش گفتم بشعر
شاعری آخر بکار آمد مرا

یا اس لئے کہ غلط ترکیبیں غلط محاورے اور غلط الفاظ جنھیں نثر گوارا نہیں کرسکتی انھیں نظم (الم ازلکم تمہاری نظم) خوشی سے قبول کرلیتی ہے۔ سچ پوچھو تو تم زبان کی خدمت نہیں کرتے بلکہ اس کی تخریب کے درپے ہو۔ لغت اور محاورہ کی فاحش ترین غلطیوں پر "ضرورت شعری" کا پردہ ڈال کر زبان کی صحت کو اس قدر نقصان پہنچا رہے ہو کہ تلافی اس کی ممکن نہیں۔ کیا وہ بزرگ تمہاری برادری کے ایک فرد نہ تھے جنھوں نے نواب مشیر الدولہ آسمان جاہ کی شان میں ایک قصیدہ جسے لکھا تھا جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

ع آسمان کے تم جاہ ہو اے دولہ مشیر الدّ

خیر گزری کہ نواب صاحب نے پہلا ہی مصرع سُنکر جناب شاعر کو مناسب صلہ دیکر رخصت کردیا ورنہ خدا جانے ضرورت شعری اور کتنے گُل کھلاتی۔ اور کیا وہ صاحب بھی تمہارے ہی بھائی نہ تھے جنھیں فارسی مصرعوں پر عربی مصرعے لگانے کا شوق تھا اور جنھوں نے ایک دن فارسی کا یہ مصرعہ موزوں فرماکر کہ

ع من از بازار خریدم گنّا

اس پر دوسرا عربی مصرعہ یوں چسپاں کیا کہ

ع قل اعوذ برب النّاس ملک النّاس الٰہ النّاس من شرّ الوسواس الخنّاس الّذی یوسوس فی صدور النّاس من الجنّۃ والنّا

اور جب اُن سے پوچھا گیا کہ والنّاس ہی کیوں نہ فرما دیا کہ سورۃ پوری ہو جاتی تو فرمایا کہ سُورۃ تو پوری ہو جاتی۔ لیکن مصرعہ لمبا ہو جاتا (سُبحان اللہ اور قافیہ بھی غلط ہو جاتا دیکھو گنجینۂ قوافی)

پس اگر شاعری کے ذریعہ تمہارا مقصود خلق خدا کی خدمت کرنا ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے اس سے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ شعر کہکر گناہگار کیوں ہوتے ہو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ جو خیالات تم نظم میں ظاہر کرتے ہو وہ تمہارے دلی خیالات نہیں۔ جس کام کے کرنے کی

لوگوں کو ترغیب دیتے ہو وہ کام تم خود نہیں کرتے۔ تمہارا فلسفہ صرف تمہاری زبان پر ہے تمہارے دل میں نہیں۔ یہ تو ہم ماننے پر تیار ہیں کہ اچھا شعر جھوٹ کا کفارہ ہو سکتا ہے لیکن یہ بتاؤ کہ بُرے شعر کس کام آتے ہیں۔

شعرِ ناگفتن بہ از اشعارِ گفتن نادرست
بچہ نازادن بہ از شش ماہہ افگندن جنین

اور

اے وہ مولویو! در مسجدوں کے اماموا در واعظو اور خطیبو! جنھوں نے عربی اس طرح پڑھی ہے جس طرح طوطا پڑھتا ہے اور جنھوں نے علم دین کو ذریعۂ معاش سمجھ کر حاصل کیا ہے بے شک متاعِ علم پر دوکانداری کرو۔ بے شک قرآن اور حدیث پیسے لئے بغیر نہ سناؤ۔ بے شک نماز کی امامت اُجرت حاصل کئے بغیر نہ کرو اور بے شک معاوضہ لئے بغیر وعظ نہ کہو۔ لیکن خدا کے لئے اتنا تو کرو کہ غریب مسلمانوں کو گمراہ نہ کرو اُن کی دینی اور دنیوی ترقی کے سدِّ باب نہ بنو۔ ان کو ابدالآباد تک جہالت میں رکھنے کی کوشش نہ کرو۔ روایت و درایت کے خلاف فضول قصّے اور کہانیاں سُنا سُنا کر ان کو حقیقت سے بیگانہ نہ بناؤ۔ مذہب کے نام پر دُور از عقل و قیاس باتیں بیان کر کے مذہب کو بدنام نہ کرو۔ اپنے علم میں اپنی عقل کو دخل دینے سے نہ روکو اور مذہبیات کے عنوان کے نیچے ایسی باتیں نہ کہو جنھیں سُن کر دُنیا کو تم پر اور تمہارے مذہب پر ہنسنے کا موقعہ ملے۔ داناؤں کا یہ مقولہ کہ "یک من علم را دہ من عقل باید" صرف علم دنیا پر ہی نہیں بلکہ علم دین پر بھی صادق آتا ہے۔ لیکن تمہاری یہ حالت ہے کہ تمہارے دہ من علم کے ساتھ عقل کی ایک رتّی بھی شامل نہیں ہوتی۔ اگر تمہارے علم کے ایک ایک من کے ساتھ دہ دہ من عقل بھی شامل ہوتی تو یقین جانو کہ اس وقت تک روئے زمین کی تمام آبادی مسلمان ہو چکی ہوتی۔

گلۂ جفائے وفانما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

کیا یہ درست نہیں کہ تمہارے خاندان کے ایک چشم و چراغ جو نہایت رنگین بیان واعظ تھے۔ اور جو وعظ کے دوران میں ایسی ایسی مذہبی کہانیاں بیان فرمایا کرتے تھے کہ جنوں اور پریوں کے قصے بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ایک روز پُل صراط کی دشوار گذاری پر وعظ کر رہے تھے اس بیان کے ضمن میں آپ نے اس پُل کی نسبت اس قسم کی من گھڑت اور ہولناک باتیں سُنائیں جو نہ کسی حدیث میں تھیں نہ کسی روایت میں۔ اس موضوع پر دو تین گھنٹے تقریر فرما چکنے کے بعد جب آپ خاموش ہوئے تو ایک صاحب اُٹھے اور کہا کہ مولوی صاحب! مختصر ہی کیوں نہ فرما دیا کہ آگے جانے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ تم ہی انصاف کرو کہ ایسے وعظ اسلامی تعلیم کی تعریف میں آسکتے ہیں؟ پھر اس سے زیادہ یہ کہ جو تعلیم تم مسلمانوں کو دیتے ہو خود اس پر کاربند نہیں۔ انہیں صبر اور توکل سکھلاتے ہو خود نہ صابر ہو نہ متوکل۔ انہیں ایثار اور صدقات کی تعلیم دیتے ہو۔ خود نہ ایثار کرتے ہو نہ صدقات۔ انھیں قیامت کے دن سے ڈراتے ہو لیکن خود نہیں ڈرتے۔ ان کے سامنے جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کرتے ہو۔ لیکن خود جہاد کے نام سے بھاگتے ہو۔ کیا تمہاری نسبت یہ کہنا صحیح نہیں کہ ؎

ترکِ دنیا بمردم آموزند   خویشتن سیم و غلہ اندوزند

اور

اے آسمانِ سٹیل کے وہ درخشندہ ستارو! (خواہ تم خطاب یافتہ ہو خواہ خطاب نایافتہ۔ اور خواہ تم پنشن یافتہ ہو خواہ پنشن نایافتہ) جنھیں عرفِ عام میں ٹوڈی یا ٹوڈی بچہ کہتے ہیں اور جن کے درِ دولت پر حاضر ہو کر مذکر اور مونث ہر دو قسم کے رضاکار ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کہہ کر ماتم کیا کرتے ہیں اور جو سازشی مقدمات میں (یعنی مقدمات سازش

میں) گواہ بنتے ہو یا گواہ بناتے ہو اور جو ہر ایسے جلسے میں جو کسی قومی تحریک کے متعلق ہو اپنے دو چار سب ٹوڈی بھیجکر جلسے میں شور و فساد بپا کرنے کی کوشش کرتے ہو اور جو ایڈمنسٹریشن کے زمانے میں آنریری سی۔ آئی۔ ڈی کا کام کرتے ہو اور جو لمبے چوڑے پوسٹروں کے ذریعہ کفر کی تائید میں قرآنی آیات پیش کرتے ہو اور جو بیہودہ رسالے اور فضول کتابیں لکھ کر اپنے خداؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنی قوم کو بے وقوف بناتے ہو اور جو اسلامی خدمت کے بہانے سے لوگوں کو آپس میں لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہو اور جو قوم کے سامنے بیٹھ کر قوم کا رونا روتے ہو اور صاحب کے بنگلے پر جاکر قوم کی سادہ لوحی پر ہنستے ہو۔ شاباش ہے تمہاری اس ابلہ فریبی پر۔ دونوں فریق تم سے خوش ہیں ان سے بھی اپنا کام نکالو اور ان سے بھی مطلب براری کرو حقیقت میں یہ دونوں اسی قابل ہیں جب تک بالکل تباہ نہ ہو جائیں نہ انھیں چھوڑو نہ انہیں ؎

مے بھی خلوت میں ہو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی ناراض نہ ہو

اور

اے وہابی پیرو! جو بایزیدی جامے میں بزیدی روایات کے حامل ہو اور جو غریب مریدوں کے پسینے کی کمائی سے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے لاکھوں روپے کی جائدادیں پیدا کر رہے ہو اور جو زہد و تقویٰ کے لباس میں شیطانی عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہو اور جو سُنی سُنائی فقیرانہ روایات اور حکایات سُنا سُنا کر جاہل لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنسا رہے ہو۔ کیا مولانا روم نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے حق میں جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست — پس بہر دستے نباید داد دست
حرف درویشاں بدزد و مرد دوں — تا بخواند بر سلیمے زاں فسوں

غریب قوم پر رحم کرو اور اپنی دوکانداری کے لئے کوئی اور سبیل نکالو۔ دولت پیدا کرنے کے کئی اور ذریعے بھی ہیں۔ صرف تصوّف ہی نہیں۔ خدا کے لئے قوم کا پیچھا چھوڑو ورنہ ہم تمہارے حالات لکھ کر مدیر فکاہات اور مدیر افکار و حوادث کو بھیجدیں گے پھر وہ جانیں اور تم

مولوی صاحب کا گھوڑا

مولوی صاحب گھوڑے پر سوار ہیں۔ کیونکہ گھوڑی پر سوار ہونا آپ صنف نازک کی توہین خیال فرماتے ہیں اور بائیسکل پر چڑھنا بدعت یہی وجہ ہے کہ از آدم تا ایں دم کہ ۱۹ر اپریل ۱۹۳۱ء کی شام کے ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔ مولوی قسم کا کوئی انسان بائیسکل پر سوار نہیں دیکھا گیا۔ اور خداوند کریم اسلام کی کمزوری کے وہ دن نہ دکھلائے کہ مولوی صاحبان بائیسکلوں پر اُڑتے پھرتے نظر آئیں ۔

مدرسے جاتے ہیں۔ سکول ماسٹر ہیں۔ اس لئے مدرسے جاتے ہیں اگر امام مسجد ہوتے تو مسجد میں تشریف لے جاتے۔ جہاں سے تنخواہ نہ ملے وہاں جانا شرعاً ممنوع ہے یا کم از کم فعل عبث۔ کیا فرماتے ہیں عالمانِ دینِ متین و حامیانِ شرعِ مُبین بیچ بارے اس مسئلہ کے؟ اما بعد ہماری پہلی جماعت کے اُستاد پنڈت اجودھیا داس صاحب ایں جہانی جو ہند و فضلائے وقت میں سے چوٹی کے آدمی ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے اُستاد سے اور انھوں نے اپنے اُستاد سے جو مولوی صاحب کے ہمعصر تھے سُنا تھا کہ مولوی صاحب مدرسے صرف اس لئے جاتے تھے کہ مولائن صاحبہ جو قدرے تلخ مزاج واقع ہوئی تھیں انھیں گھر میں آرام سے بیٹھنے نہیں دیا کرتی تھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دو تین شاگرد ساتھ ہیں مُصنّف کے حافظے نے یہاں مصنّف کا ساتھ نہیں دیا۔ اسے ٹھیک یاد نہیں کہ دو شاگرد تھے یا تین۔ اس لئے دو تین شاگرد کہہ دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو شاگرد پورے ہوں اور تیسرا آدھا یا پونا۔ شاعروں کی طرح اڑھائی یا پونے تین شاگردوں کا ہونا تاریخ کی رو سے جائز ہے۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں کسی شخص نے میر تقی سے پوچھا کہ کیوں صاحب آجکل شاعر کون کون ہے۔ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار اور کچھ تامل کر کے کہا کہ آدھے خواجہ میر درد۔ وہ بولا حضرت اور میر سوز صاحب چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ اس نے کہا کہ آخر نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہیں کہا کہ خیر! یہ ہے تو پونے تین سہی۔

ایک کے ہاتھ میں کتاب ہے جس کے پہلے درمیانی اور آخری اوراق غائب ہیں جلد ندارد ہے۔ گو آثار باقی ہیں؛

ایک کی بغل میں جزدان ہے جس کے مشمولات کی فہرست یہ ہے۔ چند پھٹی پرانی کتابیں۔ جن کا اس طالب علم کے کورس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دوات جس میں گذشتہ دو ماہ سے کبھی سیاہی نہیں ڈالی گئی۔ نصف درجن قلم جو لکھ نہیں سکتے۔ ایک درجن کالج کی گولیاں۔ ایک کاپی جو تمام لکھی ہوئی ہے۔ مگر پڑھی نہیں جا سکتی اور دیگر متفرق ضروریات؛

ایک برابر آکر کچھ پوچھ رہا ہے۔ پڑھنے اور پوچھنے کے لئے گھر میں اور سکول میں کافی وقت مل سکتا ہے مگر یہ برخوردار رستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہے تاکہ مولوی صاحب کو یقین ہو جائے کہ لڑکا بڑا محنتی ہے۔ اُستادوں کو اس طرح بیوقوف بنانے میں لڑکوں کو ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے؛

مولوی صاحب نے گھوڑا روک لیا ہے۔ اسے بتا رہے ہیں اور خود بے وقوف بن رہے ہیں۔ اتنی تمیز نہیں کہ اسے کہہ دیں کہ مدرسے جا کر پوچھ لینا۔ رستہ

میں کھڑے ہوکر پڑھانا آداب راہ (یعنی رول آف دی روڈ) کے خلاف ہے۔ ممکن ہے کہ مولوی صاحب سب کچھ سمجھتے ہوں لیکن جس طرح لڑکے انھیں فول بنا رہے ہیں وہ شہر والوں کو فول بنا رہے ہوں تاکہ لوگ سمجھیں کہ مولوی صاحب اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے ہر وقت بچوں کی تعلیم کی فکر میں رہتے ہیں۔

دوسرا پیچھے کھڑا ہے کہ یہ ہٹے تو پھر میں پوچھوں۔ یہ قطعاً غلط ہے مصنف طفلانہ سائیکالوجی سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑکا جو پیچھے کھڑا ہے وہی آدھا یا پونا شاگرد ہے۔ اس کے ارادے بڑے نیک ہیں۔ اس سوچ میں ہے کہ موقع ملے تو گھوڑے کو پیچھے سے ذرا چھیڑ دوں تاکہ مولوی صاحب قبلہ دھم سے نیچے آ رہیں۔ اگر یہ برخوردار اپنی نیت کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جائے تو طرفہ تماشا ہو۔ اور اگر مولوی صاحب گر کر دو چار روز کے لئے صاحب فراش ہو جائیں تو سکول کے لڑکے اس برخوردار کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر شہر میں اس کا پروسیشن نکالیں اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائیں۔

ایک نے سامنے سے آکر سلام کیا ہے۔ یہ سلام روستائی ہے۔ اس قدر جھک کر سلام کیا ہے کہ مولوی صاحب کو اس کی محنت اور ذہانت کا پورا پورا یقین ہو گیا ہے۔ اب اگر یہ لڑکا سبق یاد کرنے کی زحمت اٹھائے تو اس کا اپنا قصور ہے مگر ایسا قصور لڑکوں سے شاذ و نادر ہی سرزد ہوتا ہے۔ سند کی ضرورت ہو تو ناظرین اپنے عہد طفلی پر ذرا نظر ڈال لیں۔

یہ لڑکے بڑے شوقین ہیں۔ بڑے ہوں گے تو شوقین مزاج بنیں گے۔ باپ دادا کا نام روشن کریں گے۔

مولوی صاحب کے گھر جا کر بھی پڑھتے ہیں۔ مولوی صاحب کو اگر لڑکوں کے بغیر گھر میں بھی چین نہ آئے تو یہ بچارے کیا کریں۔ شوق سے تھوڑا ہی جاتے ہیں مولوی

صاحب چاہتے ہیں کہ "جنگ زنان و گریۂ طفلان" کے شور و غل سے بچے رہیں۔ ان لڑکوں کا شور و غل اس سے بدرجہا بہتر ہے بلکہ اس کے مقابلہ میں فردوس گوش ہے۔

راستے میں بھی پوچھتے جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ سکول میں بالکل کورے نہ جائیں۔

مولوی صاحب بھی دل سے چاہتے ہیں کہ ان کو کچھ آجائے۔ کیوں نہ آجائے گا ادنیٰ جماعت میں چار سال رہیں گے تو ساری الجبرا یاد ہو جائے گی

کبھی پڑھانے اور سمجھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ پڑھانے اور سمجھانے میں دریغ کریں تو سکول سے نکالے جائیں اور چوبیس گھنٹہ گھر میں رہنا پڑے۔ یہ دن رات کا قید خانہ ان کے لئے ایسا ہی ہوگا جیسا لڑکوں کے لئے سکول۔

گھر ہو یا باہر ہو۔ مولوی صاحب کے لئے دونوں برابر ہیں بلکہ گھر سے باہر اچھا۔ مدرسے کا بھی خیال ہے کہ وقت پر پہونچ جائیں۔ تاکہ لڑکے ان کی غیر حاضری میں سکول کو آگ نہ لگا دیں۔

وہاں بہت سے شاگرد بیٹھے راہ دیکھ رہے ہوں گے کہ کب بلا نازل ہوتی ہے

مولوی صاحب بڑے لیئق اور محنتی ہیں۔ لیئق بھی ہیں اور فیئق بھی ہیں گزشتہ تیس سال سے اردو کا قاعدہ پڑھا رہے ہیں اور آج تک ایسی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی کہ مولوی صاحب نے سبق میں کوئی غلطی کی ہو۔

ہمیشہ ان کی جماعت کے لڑکے امتحان میں پاس ہوتے ہیں۔ کیونکہ پلاڈ خود وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر عموماً بڑے ہمدرد ہوتے ہیں۔ لوگ کچھ کہیں مگر ان بیچاروں کو ہندستانی بچوں کے مستقبل کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سنو میاں لڑکو۔ علم بڑی دولت ہے۔ دنیا کی دولت کہ جو چھوٹی دولت کہلاتی ہے۔ پاس بھٹکنے نہیں دیتی۔ بھوکے رہو۔ ننگے رہو مگر یہ دولت جمع کرتے جاؤ۔ پچھلوں کے کام

آئے گی۔

جہاں تک ہو سکے حاصل کئے جاؤ اور فقر و فاقہ کی پرواہ نہ کرو۔
اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے گھر ہو یا مدرسہ ہو وقت کو ضائع نہ ہونے دو یعنی
کتابوں کے کیڑے بن جاؤ رزاق خدا ہے۔

پڑھنے لکھنے کی یہی عمر ہے۔ پھر شادی ہو جائے گی۔
پھر ایسی بے فکری کہاں بڑے ہو کر دنیا کے دھندوں میں پھنس جاؤ گے
اور پھر عمر بھر رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ دن رات غالب کا شعر پڑھتے رہو گے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس وقت نہ پڑھا تو عمر بھر پچھتاؤ گے اور اگر چوری ۔ اے پاس مل گئی تو پشیمانی
کے علاوہ ندامت بھی ہو گی۔

ع بر رسولاں بلاغ باشد و بس

میر ولی اللہ مصنف کتاب ہذا کی دیگر تصنیفات

۲؍ **لسان الغیب۔** حصہ اول۔ شرح دیوان حافظ مع مکمل سوانح عمری خواجہ حافظ

۲؍ 〃 حصہ دوم۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۴؍ **بادۂ ناب** ۔ مجموعہ رباعیات فارسی حیاتِ ملیہ و اسلامیہ کے حقایق و معارف

۱۲؍ **نمکدانِ فصاحت** ۔ اردو۔ فارسی۔ عربی زبان کے بہترین علمی و ادبی تاریخی اور شاعرانہ لطائف کا مجموعہ

۱۲؍ **کاس الکرام** ۔ رباعیات عمر خیام کی مفصل شرح اور حالات زندگی۔

۳؍ **بندگی** امام ابن تیمیہ کی کتاب العبودیت کا ترجمہ۔ حقائق دینی اور عقاید اسلامی پر نہایت جامع کتاب

ملنے کا پتہ

مینجر نیرنگ خیال پبلشنگ کمپنی

شاہی محلہ — لاہور

گیلانی پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا۔ اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے شاہی محلہ لاہور سے شایع کیا۔

دیگر مُصنّفین کی مزاحیہ کتابیں

شریر بیوی۔ مولانا مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی جن کے مضامین اکثر رسائل یا اخبارات کی زینت ہوتے ہیں کا شاہکار ہے۔ پہلا ایڈیشن قریب الاختتام اور دوسرا ایڈیشن تیاری ہے۔ ... ... قیمت ۸ عہ/

موجِ تبسم۔ مولانا شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا دلکش مجموعہ ... ۸ عہ/

بحرِ تبسم " " " " " " ... ۸ عہ/

مزاجی۔ جناب ایم۔ ایم اسلم کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ... ... ۴ عا/

روحِ ظرافت۔ انگوٹھی کی مصیبت اور دیگر مزاحیہ افسانے۔ از مرزا عظیم بیگ چغتائی ... ۴ عہ/

نکاتِ رموزی۔ مولانا رموزی کے مزاحیہ مضامین حصہ اوّل عہ، حصہ دوم ... ۴ عہ/

صبحِ لطافت " " " " " ... عا/

شادی " " " " " " ... ۸ عہ/

پطرس کے مضامین۔ سید احمد شاہ بخاری ایم۔ اے پطرس کے لاجواب مضامین کا مجموعہ عا/

عورت ذات۔ مولانا رموزی کے مزاحیہ مضامین۔ ہر طبقہ کی عورت کے حالات ۸ سے/

لاٹھی اور بھینس " " " " " " ۴ عہ/

حاجی بغلول۔ سید سجاد صاحب کا لاجواب مزاحیہ ناول ۱۲/

انتخاب اودھ پنچ۔ اودھ پنچ کے مزاحیہ مضامین کا انتخاب ... ... ۸ عہ/

کولتار۔ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا شاہکار مزاحیہ مضامین ... ... عا/

دیوانِ ملا رموزی ۴ / سوانح ملا رموزی ۴ / چمنستانِ ظرافت ۸ /
چینی کی انگوٹھی اور لوہے کا راز ۸ / مرزا جنگی ۱۲ /

مینیجر نیرنگِ خیال پبلشنگ کمپنی شاہی محلہ لاہور

ڈرامہ کی کتابیں

راج دُلاری۔ بالکل نئی طرز کا ڈراما از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ... ... عہ/

قومی آن۔ ہندو قوم کے مایہ ناز سپوتوں کے صحیح جذبات کا مرقع ۲/

ناٹک کتھا۔ از محمد عمر نور الٰہی ۶/

تارا۔ از بابو کشیرود چندر چٹرجی مترجمہ حکیم احمد شجاع بی۔ اے ۷/

مینا۔ از بابو کشیرود چندر چٹرجی مترجمہ حکیم احمد شجاع ۱۲/

منتوش۔ از بابو کشیرود چندر چٹرجی مترجمہ حکیم احمد شجاع ۸/

پردۂ غفلت۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین مطبوعہ جرمنی ... ... عہ/

مراری دادا۔ ایک نہایت ہی دلچسپ سوسائٹی ڈرامہ از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ۴/

جلال الدین خوارزم شاہ۔ ترکی زبان کے مشہور مصنف نامق کمال بے کے تاریخی ڈرامے کا ترجمہ۔ از سید سجاد حیدر یلدرم ... ... عہ/

کھیتی۔ از پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن ۶/

پرانا خواب۔ ایک ترکی ڈرامہ۔ از سجاد حیدر یلدرم ۱۰/

بچوں کا انصاف۔ از محمد عبد الغفار مدہولی ۴/

گناہ کی دیوار۔ محمد اشتیاق حسین قریشی ۸/

شریر لڑکا۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین ۴/

محنت۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ ۴/

زود پشیماں۔ اردو زبان میں سب سے انوکھا اور دلچسپ ڈرامہ ۸/

ظفر کی موت۔ از محمد عمر نور الٰہی۔ بلجیم ڈراما	۴ر
تین ٹوپیاں۔ دور جاریہ کی ایک فرانسیسی تصنیف کا عکس۔ محمد عمر نور الٰہی	۸ر
وکرم اروسی۔ مہاکوی کالی داس کے ایک مشہور ناٹک کا ترجمہ	عہ۸ر
ہمزاد۔ از اشتیاق حسین قریشی	۶ر
قوم پرست طالب علم۔ محمد عبد الغفار مدہولوی	۴ر
فراق۔ از محمد عمر نور الٰہی۔ جرمن ڈراما	۸ر
بگڑے دل۔ محمد عمر نور الٰہی۔ فرانس کے مشہور ڈراما نویس کی کومیڈی	۸ر
اسکول کی زندگی۔ محمد عبد الغفار مدہولوی	۴ر
سلومی۔ آسکر وائلڈ کا مشہور ڈراما۔ مترجمہ انصار ناصری دہلوی	۵ر
اندر سبھا۔ مصنفہ آغا امانت لکھنوی	۸ر

ناٹک ساگر۔ دنیائے ڈرامہ کی تاریخ۔ دنیا بھر کے مشاہیر ڈرامہ نگاروں۔ ایکٹروں وغیرہ کے حالات۔ جملہ ممالک میں سٹیج کے عروج و زوال۔ فن ڈراما پر تنقید وغیرہ سے

ناٹک ساگر کے دو باب۔ تاریخ ڈرامہ ہند و ایران۔ نصاب آنرز ان اردو ... عہر

ملنے کا پتہ

مینجر نیرنگِ خیال پبلشنگ کمپنی

شاہی محلہ لاہور

نیرنگ خیال لاہور

ملک کا بہترین اور ارزاں ترین رسالہ

نیرنگ خیال ملک کا بہترین اور ارزاں ترین رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے اور نیرنگ خیال ہر گھر میں ضرورت کی چیز سمجھ کر خریدا جاتا ہے۔ اس کے مضامین دلکش اس کی تصاویر بلند پایہ۔ اس کا حجم کثیر۔ اس کے خاص نمبر مقبول و معروف اس کا چندہ سب سے قلیل

نیرنگ خیال خریدنا اور اس کی اشاعت بڑھانا ملک کے لٹریچر کی خدمت کرنا ہے

چندہ سالانہ ہے۔

پتہ

منیجر رسالہ نیرنگ خیال

شاہی محلہ لاہور

تازیانہ ریویو

ہفتہ وار اخبار دنیں مقبول و معروف

مسلمانوں کے ہفتہ وار اخبارات کی تعداد کم ہے اور جو موجود بھی ہیں وہ ہر قسم کی اخباری خوبیوں سے خالی ہیں۔ تازیانہ ریویو چار پانچ سال سے برابر ملک و ملت کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ بڑے سائز کے سال بھر میں ۹۶۰ صفحات عمدہ لکھائی چھپائی کیساتھ پیش کئے جاتے ہیں اخباری ضروریات کیساتھ علمی ادبی دلچسپیاں بھی قائم رکھی جاتی ہیں ٹائیٹل پر تصویر بھی ہوتی ہے مگر چندہ سالانہ صرف ۳ روپے ہے۔ اس پرچہ کو ضرور جاری کرائیے ؂

پتہ

منیجر تازیانہ ریویو

شاہی محلہ لاہور

کے ہاتھ اون کو رقعہ بھیج دون ۔
شوبھاشنی ۔ اچھا کسی مہری کے ہاتھ سہی
مین ۔ وہ اتنی دیانت دار کب ہے ؟ نہین معلوم کیا اتفاق ہو کوئی بکھیڑا اٹھ کھڑا ہو تو سارا بنا بنایا گھروندا بگڑ جائے ۔
شوبھاشنی ۔ اچھا ۔ ہرانی تو رازدار ہے ۔
مین ۔ بے شک ۔ اوس کی رازداری اور دیانت داری کا یہی ثبوت ہے ۔ کہ مین نے اوس سے کہا تھا وہ نہین مانتی ۔ ہان اگر تم کہو تو شاید قبول کرے ۔ مگر مین کیونکر کہون کہ تم اوس سے کہو ۔
شوبھاشنی ۔ ہرانی نے کیا جواب دیا ۔
مین ۔ اگر تم منع نہ کرو گی تو وُہ چلی جائے گی ۔
شوبھاشنی ۔ (ذرا تامل کرکے) اچھا اوسے شام کو میرے پاس بُلا لانا ۔

تیرھوان باب (۱۳)

امتحان مین پاس ہوئی

شام کو میرے شوہر مقدمہ کے کاغذات لیے [illegible] کے پاس آئے ۔
یہ سن کے مین اس مرتبہ اور ہرانی کی منتین کین مگر پھر بھی اوس نے وہی جواب دیا کہ اگر بہو رانی منع نہ کرین گی تو مین چلی جاؤن گی اور سمجھ لون گی ۔ کہ اس مین کوئی عیب نہین ہے ۔
مین ۔ مین نہین جانتی جو تم مناسب سمجھو وہ کرو ۔ مگر مجھے جلدی بہت ہے ۔
مسکراتی ہوئی ہرانی شوبھاشنی کے پاس گئی اور مین اوس کا انتظار

لمحہ بھر کے بعد ہرانی سے قہقہہ لگاتی ہوئی اور پریشان بالون کو سنوارتی ہوئی ۔ اور ہانپتی ہوئی آئی ۔